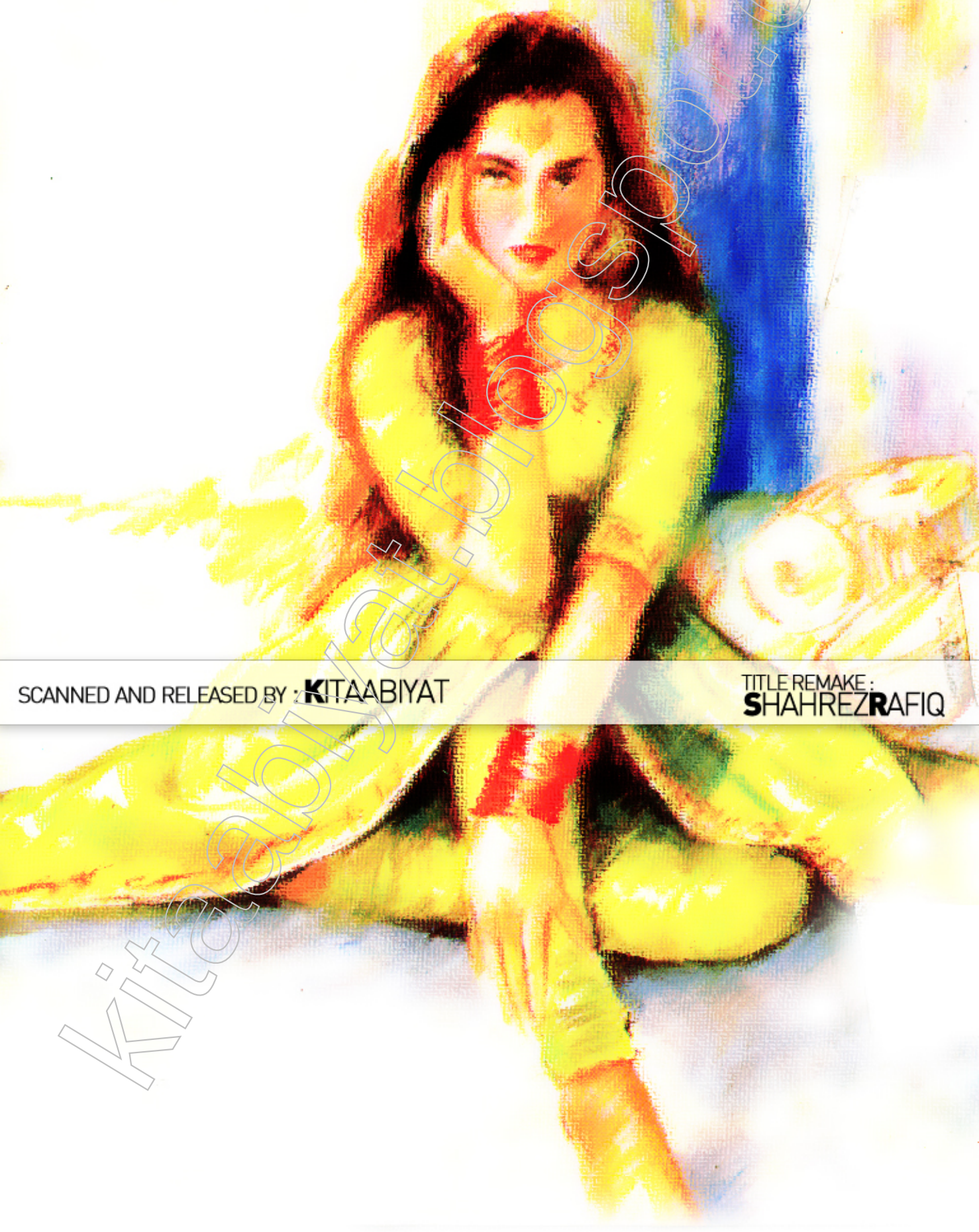


امراؤ جہان ادا

مرزا باہادی رسوا



SCANNED AND RELEASED BY : **KITAABIYAT**

TITLE REMAKE :
SHAHREZRAFIQ

تمہید

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

ناظرین! شان نزول اس قصے کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے، میرے ایک دوست منشی احمد حسن صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے یہ طریق سیر و سیاحت لکھنو تشریف لائے تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے چھانک کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سر شام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجے کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے، لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا، اس لیے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سر راہ بیٹھے دیکھا، نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا دروازہ بالکل مقفل رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا، اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک بھونٹی سی کھڑکی لگی تھی، مگر اس میں کڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک دن حسب معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا، احباب داد دے رہے تھے۔ اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ وا کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا، اور احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسن نے پکار کے کہا۔ ”غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں، اگر شوق شعر و سخن ہے تو جلعے میں تشریف لائیے۔“ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا، بات، رفت و گشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مہری آئی۔ اس نے پہلے سب کو سلام کیا، پھر یہ کہا۔ ”مرزا سوا کون صاحب ہیں؟“ احباب نے

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارت گر ہوش
جیسی صورت ہے مری ویسی ہی ہسیر بھی ہو

مجھے بتادیا۔ مہری نے کہا ”بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔“ میں نے کہا ”کون بیوی؟“ مہری نے کہا ”بیوی نے کہہ دیا ہے نام نہ بتانا آگے جو آپ کا حکم ہو۔“ مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے، ”ہاں صاحب! جاتے کیوں نہیں، کبھی کی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا۔“ میں دل میں غور کر رہا تھا کون صاحب ایسی بے تکلف ہیں۔ ادھر مہری نے کہا، ”حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں، جب تو بلا بھیجا۔“ آخر جانا ہی پڑا۔ جا کے جو دیکھا، معلوم ہوا، آہ ہا! امراؤ جان صاحب تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان:- (دیکھتے ہی) اللہ! مرزا صاحب! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں:- یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کس کوہ قاف میں رہتی ہیں؟

امراؤ جان:- یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلا نے کی جرات نہ ہوئی۔ آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منہ سے واہ وا نکل گیا۔ ادھر کسی صاحب نے کہا:- ”یہاں آئیے۔“ میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ رہوں، مگر پھر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجیے گا۔ ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجیئے۔

میں:- معاف تو کچھ بھی نہیں ہو گا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلیئے۔

امراؤ جان:- مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں، مگر یہ خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔

میں:- آپ کے حواس درست ہیں! بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لیے کیوں کہتا؟ بے تکلف صحبت ہے، آپ کے جانے سے اور لطف ہو گا۔

امراؤ جان:- یہ تو سچ ہے، مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو؟

میں:- جی نہیں، وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

امراؤ جان:- اچھا تو کل آؤں گی۔

میں:- ابھی کیوں نہیں چلتیں؟

امراؤ جان:- اے ہے، ابھی؟ دیکھیے تو کس حیثیت سے پیٹھی ہوں!

میں:- وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے، چلی چلیے۔

امراؤ جان:- ادنیٰ مرزا! آپ کی تو باتیں لا جواب ہوتی ہیں، اچھا چلیے میں آتی ہوں۔
میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحب ذرا کنگھی و نگھی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مزاق شعرو سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی، لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ کبھی شعرو شاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انہوں نے کچھ گایا، احباب محفوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لیے جاتے تھے۔ صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔
مشاعرہ

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا سوا:- کیا کہنا بی امراؤ جان صاحب! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے۔ اور شعر کیوں نہ پڑھے؟

امراؤ جان:- تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مقطع۔ خدا جانے کس زمانے کی غزل ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے، بیاض نگوڑی گم ہو گئی۔

منشی صاحب:- اور وہ مطلع کیا تھا؟ ہم نے نہیں سنا۔

مرزا سوا:- آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں، سننے کون؟

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لیے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے۔ سے چھو کاڑ ہوا تھا، تاکہ شام تک زمین سرد ہو جائے۔ اسی پر دری بچا کے اعلیٰ چاندنی کافرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آپ نورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کافذی ہانڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلو ریاں سرخ مٹائی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بٹا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار آمبا کورک دیا تھا۔ ڈیڑھ۔ نئے حقوں

کے بیچے ہیں پانی چھوک چھوک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی، اس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا، صرف ایک سفید کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب، وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودے کے ایک ایک پیالے کا دور چلا، پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب:- تو پھر اہتمام آپ کیجیے، بندہ شعر سنے۔

رسوا:- معاف فرمائیے، یہ درد سر مجھ سے نہ ہو گا۔

منشی صاحب:- اچھا وہ مطلع کیا تھا،

امراؤ:- میں عرض کیے دیتی ہوں:

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی

ایمان بچ گیا، مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب:- خوب کہا ہے!

خان صاحب:- اچھا مطلع کہا ہے، مگر یہ ”بھول گیا“ کیوں؟

امراؤ جان:- تو کیا خان صاحب میں رنختی کہتی ہوں؟

خان صاحب:- مزا تو رنختی کا ہے۔ ”میرے مولا نے خیر کی“ آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا:- بس آپ کے جملے شروع ہو گئے، لے شعر سننے دیجیے۔ خان صاحب! دنیا میں اگر سب

آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزا تشریف لے جائے!

ہر گھلے را رنگ و بوئے دیگر است

خان صاحب:- (کسی قدر برے تیوروں سے) درست۔

رسوا:- امراؤ جان، اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو!

امراؤ جان:- دیکھیے کچھ آئے تو عرض کروں۔

(تھوڑی دیر کے بعد)

شب فرقت بسر نہیں ہوتی

نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

حضار جلسہ:- واہ! سبحان اللہ! کیا کہنا!

امراؤ جان:- (تسلیمیں کر کے) یہ شعر ملاحظہ ہو:

شور فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی
رسوا:- کیا شعر کہا ہے! (حضار نے بھی تعریف کی)

امراؤ جان:- آپ کی عنایت ہے تسلیم، تسلیم!

تیرے کوپے کے بے نواؤں کو
ہوس مال و زر نہیں ہوتی

احباب:- تعریف

امراؤ:- تسلیم!

امراؤ جان:-

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا:- واہ! خان صاحب یہ شعر ملاحظہ ہو۔

خان صاحب:- سبحان اللہ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے!

امراؤ جان:- (تسلیم) آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں۔

ع: در نہ میں کیا مری حقیقت کیا

ہے یقین وہ نہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خان صاحب:- یہ بگی خوب کہا!

پنڈت صاحب:- کیا طرز کلام ہے!

امراؤ:- (تسلیم کر کے)

اب کس امید پر نظر میری
شکوہ بنی نہیں ہوتی

خان صاحب:- کیا اچھا کہا ہے! فارسیت نیک رہی ہے۔

منشی صاحب:- جو کچھ ہو، مضمون اچھا ہے۔

امراؤ:- تسلیم!

ہم اسیران عشق کو، صیاد
ہوس بال د پر نہیں ہوتی

اجباب:- تعریف
امراؤ:- تسلیم!

غلط انداز ہی سہی، وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خان صاحب:- ہاں ہونا تو چاہیے۔ خوب کہا ہے!

امراؤ:- تسلیم! مقطع ملاحظہ ہو:

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

خان صاحب:- کیا مقطع کہا ہے! یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں؟ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف

ہے۔

امراؤ:- ذاتی تجربہ جو کچھ ہو، میں نے تو ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔

رسوا:- اچھا، ذرا پھر تو پڑھیے۔

امراؤ جان نے پھر پڑھا۔

رسوا:- مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکلتے ہیں۔

خان صاحب:- واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی!

اجباب:- غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ میں ہے۔ اعلیٰ درجے کا مذاق ہے!

آغا صاحب:- نشست الفاظ تو ملاحظہ کیجیے!

پنڈت صاحب:- کیا درختانی کی ہے!

امراؤ جان:- (کھردی ہو کے) ”تسلیم!“

منشی صاحب:- خان صاحب، اب آپ کچھ ارشاد کیجیے۔

خان صاحب:- حضرت! مجھے تو معاف کیجیے، کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

رسوا:- کچھ تو پڑھیے۔

خان صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے:

حیف بنت العنب نہیں ملتی
ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا:- کیا اچھا کنایہ ہے، یعنی شب چار دہم۔

خان صاحب:- تسلیم!

یوں تو ملتی ہے داد صنعت شعر
داد حسن طلب نہیں ملتی

خان صاحب:- تسلیم!

رسوا:- کیا کہنا! خوب فرمایا!

شوخیوں سے کسی کی، میری مراد
پیلے ملتی تھی، اب نہیں ملتی

رسوا:- لا جواب شعر کہا ہے۔

خان صاحب:- تسلیم!

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ہاتھ میں لائین تھی۔

خان صاحب:- یہ کون صاحب آتے ہیں؟ شب ماہ میں لائین کی کیا ضرورت تھی؟

نواب صاحب:- حضرت حماقت تو ہوئی، معاف کیجیے گا۔

خان صاحب:- افادہ نواب صاحب! یہ حضور مضائقہ ندارد۔

نواب صاحب تشریف لائے، سب نے تعظیم کی۔ غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

نواب صاحب:- میں تو آپ صاحبوں کا حشاک ہو کے آیا ہوں، مجھے تو کچھ یاد داد نہیں۔

شیخ صاحب:- جناب غزل پڑھنا ہوگی۔

ب صاحب:- اچھا، جو کچھ یاد آتا ہے، عرض کیے دیتا ہوں

دل میں کھپ جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک

کارگر ہو گا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

اجباب:- سبحان اللہ! داد! کیا مطلع فرمایا ہے۔

نواب صاحب:- (جھک جھک کے تسلیمیں کرنے لگے) شعر ملاحظہ ہو:

کوئی حوروں پہ فدا، کوئی بتوں پر شیدا

ڈھونڈ ہی لیتے ہیں انسان، خدا ایک نہ ایک

اجباب:- واہ! کیا شعر کہا ہے!

نواب صاحب:- تسلیم (اس کے بعد چپ ہو رہے)۔

رسوا:- اور کچھ ارشاد ہو۔

نواب صاحب:- واللہ! اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

منشی صاحب:- پنڈت صاحب! اب آپ داد فصاحت دیجیے۔

پنڈت جی:- اشتالاً للکلام دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں:

وصل میں ذکر عدد بھی دم بہ دم ہوتا رہا

شربت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

اجباب:- تعریف

پنڈت جی:-

زاہدا! دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا

ورنہ کعبے میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا

نواب صاحب:- یہ ہم نہیں کہہ سکتے، مگر خوب کہا ہے!

پنڈت صاحب:- کہیے یا نہ کہیے، مگر بات سچی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

واعظا! کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو

جس کا سر نقش قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

اجباب:- تعریف

پنڈت جی:-

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیے

مو بہ مو حال پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوا:- یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے۔

پنڈت جی:- اور آپ دہلی کے کب ہیں؟

رسوا:- اچھا شعر پڑھیے، میں نے تو ایک بات کہی۔

پنڈت جی:-

دل جو تھا پہلے گل نورستہ باغ مراد

غار غار حسرت رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب:- دیکھیے کیا شعر کہا ہے!

خان صاحب:- متانت الفاظ ملاحظہ ہو!

پنڈت جی:- تسلیم! مقطع ملاحظہ ہو:

شکر یہ محسوس اس کا کب ادا تجھ سے ہوا

ہر نفس تجھ پر جو خالق کا کرم ہوتا رہا

خان صاحب:- سبحان اللہ! ہر نفس کہ فردی رد و محمد حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات۔

رسوا:- خان صاحب! آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے۔

اجباب:- سبحان اللہ، کیا غزل فرمائی ہے!

پنڈت جی:- آپ کی عنایت، پرورش، بندہ نوازی۔ واللہ! یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے۔

منشی صاحب:- شیخ صاحب! آپ بھی تو کچھ ارشاد کیجیے۔

شیخ صاحب:- (مسکرا کر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

خان صاحب:- یاد نہیں، مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہوگی۔

شیخ صاحب:- واللہ نہیں، صرف چار شعر بھی موزوں کر لیے ہیں۔

رسوا:- تو پھر پڑھتے کیوں نہیں!

شیخ صاحب:- عرض کیے دیتا ہوں۔

عرضی وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو

بات دو بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

اجباب:- تعریف

شیخ صاحب:- تسلیم!

مثل یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہو

کیا ہی شراؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسوا:- کیا اچھا مذاق ہے!

شیخ صاحب:- تسلیم

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جے
جنس وہ خوب، کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خان صاحب :- بہت خوب!

شیخ صاحب :- تسلیم

قتل عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو

ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

اتے ہیں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسن کو دیا

منشی صاحب :- (رقعہ پڑھ کے) لیجیے، مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے، غزل تازہ تصنیف بھیج دی

ہے۔

میں نے آدمی سے پوچھا "کرتے کیا ہیں؟"

آدمی :- (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سرشام بہت سے انگریزی درختوں کے ناندے

لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر بجا رہے ہیں۔ مٹی

پانی دیتا جاتا ہے۔

رسوا :- جی ہاں، انہیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں تشریف لائیں۔

منشی صاحب :- واللہ کیا صحبت کو بے لطیف کیا ہے۔ نہ آئے نا، اچھا غزل ہی پڑھ دیجیے۔

رسوا :- مجھ سے تو کچھ نہ پڑھوائیے گا؟

منشی صاحب :- ہاں خوب یاد آیا، اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجیے۔

رسوا :-

نہ پوچھو ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گزرتے ہیں
کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکتے ہیں
ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوق جرات پر
نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں
تماشا ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں

بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکتے ہیں
انہی کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے
کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں
بگڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بتا نہیں ممکن
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں
کبھی شانے سے الجھے وہ، کبھی آئینے کو توڑا
سنورنے میں بگڑتے ہیں، بگڑنے میں سنورتے ہیں
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جو بن کی
دوپٹہ اوڑھ کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں
ادا سے ناز کو رسوا ہے دعویٰ پارسل کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

اجباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوا نے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا

شروع کی:

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
محبودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان موذیوں سے قتل اگر زیر ہو گئی
اے موت! تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی تیر ہو گئی
آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ کیا تو ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

ملنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے
کم بخت تو تو آ کے یہیں ڈھیر ہو گئی
دیکھی ہوئی تھی گرہ صفت خواہش گناہ
پھکارنے سے پھول گئی، شیر ہو گئی
مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تا چند انتظار؟ بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد مطہر الحق نامی ایک شاعر، کہیں باہر کے رہنے والے، جو اس وقت اتفاق سے وارد
مشاعرہ تھے، انہوں نے یہ نظم پڑھی:

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال
جس کی اب نقل کرتے ہیں نفاں
روش اہل فن پہ بنتے ہیں
رنگ بزم سخن پہ بنتے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توہ
شاعری کی یہ قدر ہے توہ
گو کہ پاس ادب نہیں کرتے
جو کچھ ہے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعران خوش تقریر
اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر
کب سخن در اکیلے جاتے ہیں
قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں
جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت
ساتھ ہوتے ہیں بے شمار پمندیت
جن کے ہم راہ یہ ہجوم نہ ہو
کبھی ان کی غزل کی دھوم نہ ہو
اک ادھر واہ واہ کرتا ہے

اک ادھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرز درختی ہے
واہ کیا وضع خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے ”واہ کیا کہنا
فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا
اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی
کب ہے استاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں
واقعی فخر میر و مرزا ہیں
کب میر تھا ان کو حسن کلام
کچھ نہ تھے وہ، فقط ہے نام ہی نام
ان کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں
بخدا! آپ ان سے بہتر ہیں
ان سے واللہ! آپ اچھے ہیں
شم باللہ! آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز
نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز
آپ قدرت نمائے معنی ہیں
فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منہ کھولے
کس کا مقدر ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصہ
ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور
آپ ہی آپ ہیں، نہیں کچھ اور

آپ ایسے ہیں، آپ ویسے ہیں
 ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
 آپ کیا قدر اپنی پہچانیں
 پوچھیے ہم سے، آپ کیا جانیں
 آپ کا کام ہے ہوا بندی
 آپ پر ختم ہے ادا بندی
 ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا
 نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
 الغرض بے تکی اڑاتے ہیں
 بچے جاتے ہیں، لوٹے جاتے ہیں
 ان کی تعریف ہے وہ لا طائل
 جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل
 منہ سے وہ شمر ادھر نکالتے ہیں
 یہ ادھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں
 جن کی تعریف کا تھا یہ مذکور
 اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور
 اگر اس میں کسی کو غصہ آئے
 کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے
 نہیں یہ بات کچھ تعجب کی
 بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی
 پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے
 ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے
 گو بہ ظاہر ہے انکسار بہت
 دل میں ہے جوش افتخار بہت
 کس قدر تفتے ہیں برتے ہیں

خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں
 ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح
 ہوتی ہے بات بات کی تصریح
 کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق
 جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق
 کس قدر دور ہیں معاذ اللہ !
 کیسے مغرور ہیں معاذ اللہ !
 نکتہ فہم ایسے، نکتہ داں ایسے
 شاعر ایسے ہیں، قدر داں ایسے
 جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا
 جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا
 اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے
 کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے
 گو کہ میری مذمتیں ہوں گی
 میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی
 صاف گوئی کی داد پاؤں گا
 میں بھی اپنی مراد پاؤں گا
 کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈردوں
 بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزردوں
 مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی
 بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی
 طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں
 ردش اہل فن سے ناخوش ہوں
 شاعری ہے اگر اسی کا نام
 دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔ ہر شعر پر اہل محفل تعریف کرتے جاتے تھے۔
منشی صاحب پر دجہ کا عالم طاری تھا، امراؤ جان جھوم رہی تھیں۔ اور میرا جو حال تھا وہ میرے ہی دل سے
کوئی پوچھے۔

منشی صاحب:- ہاں جناب! آغا صاحب! اب آپ کچھ عنایت فرمائیے۔

آغا صاحب:- بہت خوب! مطلع اول ملاحظہ ہو۔

کہیں سلمان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
منر ابلے ہوئے ہوں اور اک ٹھہرے کی بوتل ہو
احباب:- آغا صاحب! کیا مقطع فرمایا ہے!

آغا صاحب:- اے حضرت! ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے، دوسرا مطلع سنئے۔

وہ مضمون ڈھونڈ کر باندھوں کہ جو اشکل سے اشکل ہو
کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اول سے اول ہو
احباب:- بے شک، اول سے اول ہے۔

آغا صاحب:- لے اب شعر ملاحظہ ہوں:

(اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتا، ہلکا بادامی رنگا اور بار یک ململ کا انگرکھا
پینے، بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی، اسے جھلے جاتے تھے)۔

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفیں ہوں شانے پر دو ٹالہ ہو نہ کمل ہو
احباب:- تعریف۔

آغا صاحب:-

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجھوں
کہ چر لے ناقہ لیلیٰ ہری جب دل کی کونیل ہو
پنڈت جی:- سبحان اللہ! اور تو ادھر یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے!

احباب:- واللہ سمجھے بھی خوب! سمجھو تو ایسی ہو، نہیں تو نہ ہو۔

آغا صاحب:- نہ ہو! اچھا اب یہ شعر سنئے:

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں

رکے گا راستہ گھر کا اگر کوپے میں دلدل ہو
شیخ صاحب:- ابھی کمی!

رسوا:- (غان صاحب سے) آپ کیوں سکوت میں ہیں، کوئی اعتراض نکالیے؟

آغا صاحب:- ہاں جناب! سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔

غان صاحب:- آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھیے؟ اس لیے چپ ہوں۔

آغا صاحب:- نہیں حضرت، میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔ احباب اس فقرے پر لوٹ گئے۔

آغا صاحب:- ملاحظہ ہو

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق اول ہو
احباب:- آغا صاحب! سبحان اللہ! کیا نازک خیالی ہے۔

آغا صاحب:-

ابھی کم سن ہیں، ان کو شوق ہے لنگڑ لڑانے کا
تکلا ڈور کا ہو اک، نہ کنکلیا نہ تکل ہو
اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی جانب تھا، اس لیے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے کنکولے کی
برائت بڑی دھوم سے نکل تھی۔

آغا صاحب:-

کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھیلے کیا راز سر بستہ جو دروازہ مقفل ہو
رسوا:- آغا صاحب! کیا کہنا! امراؤ جان! ذرا سستا، کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان:- سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں، مالک ہیں۔

آغا صاحب:- تو صاحب کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنئے۔

کسی صورت سے بہلا نہیں گئے اس معشوق کم سن کو

ذیل پیہ نہ ہو، ریوڑی نہ ہو تو گول گیل ہو

احباب:- کیا کہنا!

آغا صاحب:-

کبھی گلی سنا بیٹھے، کبھی جوتے لگا بیٹھے
حکومت کا مرا آئے اگر معشوق ارذل ہو
خان صاحب:- درست، مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب:- جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی شفتل ہو
نواب صاحب:- خوب! مگر ردائے سخن کس کی طرف ہے؟

آغا صاحب:- یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، اس لیے کہ آپ محرم راز ہیں، السور عند کرام الناس
مکتوم۔

خان صاحب:- آپ جواب دیجیئے۔

آغا صاحب:- آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنئے۔

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جس میں غمڑے ہوں، فرس کی جس میں چھلبل ہو

اجباب:- واہری ہمت!

آغا صاحب:- اچھا نہ کسی، یہ سنئے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے ادھل ہو

اجباب:- خوب!

آغا صاحب:-

تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو، نہ کنکھی ہو، نہ مٹی ہو، نہ کاجل ہو

امراؤ جان:- اوئی! تو کیا دن رات سر جھاز منہ پہاڑ بیٹھا رہے؟

آغا صاحب:- سادگی کا یہی مزا ہے، اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔ (اس مذاق میں لطف یہ ہے

کہ امراؤ جان کسی قدر خفیں مشہور تھیں)۔

لکا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں

نہ بک بک ہو، نہ جھک جھک ہو، نہ کچ کچ ہو، نہ کل کل ہو
اجباب:- کیا مصرع کہا ہے!

خان صاحب:- اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ارذل کی رعایت چلی جاتی ہے۔
(امراؤ جان ہنسنے ہنسنے لوٹی جاتی تھیں)۔

آغا صاحب:- اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں گے۔ ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے۔ نازک خیالی سنئے۔

تری نازک کمر کے باب میں چمک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گشتل ہو

خان صاحب:- میں تسلیم کیے لیتا ہوں، میری طبیعت ایسی ہی ہے جیسا آپ ارشاد فرماتے ہیں، مگر
برائے خدا اس چمک کے معنی سمجھا دیجئے۔

آغا صاحب:- خیر خاطر ہے، سن لیجئے۔ محاسب لوگ خانہ پری کے لیے بجائے ندارد کے (X) نشان بنا دیا
کرتے ہیں، اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے۔ دوسرے ایک خط نے
بچوں بچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی اور
پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔

خان صاحب:- یہ کیوں کر؟

آغا صاحب:- اب اس باریکی کو نہ پوچھیے۔ خیر حضرات واضح ہو کہ چمک علم ریاضی میں علامت جمع کی
ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی۔

مطلب یہ نکلا کہ کمر بادیہ معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔

اجباب:- حضرت! بس نازک خیالی کی حد ہو گئی! جو کوئی اسنا علم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب:- اسی سے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس! استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے،
نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر آپ یہ مقطع
سن لیجئے۔ طبیعت کو کافت ہو گئی، کوئی تدر واں نہیں ہے۔

بس اے قزاق بس! طبع کیامت، خیز کو روکو

غضب ہو جائے گا فوج مضامین میں جو بلبل ہو

مقطع پھر عنایت ہو۔ (آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا)۔

نواب صاحب:- کیا زبردست تخلص رکھا ہے، قزاق!

آغا صاحب۔۔۔ معاف فرمائیے گا ہے تو کچھ ایسا ہی، مگر کچھ ایسا نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو غاندی اعتبار سے، اس لیے کہ فدوی کے آباء اجداد دشت قباچ میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے، اور یہ کچھ ایسا نامناسب بھی نہ تھا اس لیے کہ (ان کی روح نہ شرمندہ ہو) عمر بھر لکھے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کیے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجیے، شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب اشہب غامہ کی لکام میرے دست اقتدار میں آئی تو میں نے سرفروشی کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قرائق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانگ بین تو ہے۔ بندے کا یہ دستور رہا ہے اور رہے گا کہ شعرائے ماضی و حال و استقبال کے مضافین زبردستی چھین کر اپنے قبضہ، تصرف میں کر لوں گا۔

نواب صاحب۔۔۔ بہت مبارک!

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسے کی برف چائی گئی، اس کی دو دو تلفیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھا۔ منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب۔۔۔ (امراؤ جان سے) ذرا اپنا وہ مقطع پڑھیے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔

امراؤ جان۔۔۔ کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دل چسپ ہوں گے۔ جب سے آپ نے یہ مقطع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو لطف سے غالی نہ ہو گا۔

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی، مگر امراؤ جان پہلو بچاتی تھیں۔ ہمارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے تھے کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ ”الف لیلا“، امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ ”بوستان خیال“ کی کل جلدیں فقرے گزری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو، مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی، اکثر ناول نویسوں کے بے شک تھے، مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بہبودہ جوش دلانے دلی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ لکھنؤ کے با مذاق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آئی تھی۔ امراؤ جان کے اس مقطع

نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتقاق نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر راضی ہو گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی۔ اور کیوں نہ ہو، ادلی تو خواندہ، دوسرے اعلیٰ درجے کی رندیوں میں پرورش پائی، شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی، محلات شاہی تک اس کی رسائی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہو گا۔ اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں، میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت ہی بگڑیں مگر اب کیا ہوتا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جاہ جاو کچھ رہ گیا تھا اے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب۔۔۔ صاحب سے ملاقت تھی۔ انہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا مجھے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، مگر یہ میری ذاتی رائے ہے، ناظرین کو اختیار ہے، جو چاہیں تمیاس کر لیں۔

مرزا رسوا

لکھنؤ مارچ 1899ء

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمرے پہنٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے ددڑا دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باپچیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھایا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی غالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھیریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تھامنے شروع ہو گئے ”ابا، اللہ! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو!“ میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے، تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لوا بھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا بہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا بہنوں کی۔ ہاں میں تو نیا بہنوں کی۔ ”جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی نوکری اور سالن کی پتیلی اٹھالائی۔ دسترخوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشاء کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے، نماز پڑھی، اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی، پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

”میرے ابا! آج نہ بھوننا، گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔“ ابا صبح کی نماز پڑھ کے وغینہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے، ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ استے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیوں کہ ابا بہر دن پڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پر دے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی، یاد دروازے پر اٹلی کا درخت تھا، وہاں چلی گئی۔ سمجھتی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے، بھیا کو بٹھا دیا، خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے! کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیوں کہ سمجھتی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نکالیں پائی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی، وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کٹھریا یا کھیریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھیریل پڑی ہوئی دو کھڑکیاں تھیں۔ دالان کے سامنے باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کھیریل، دو کھڑکیاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنئے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیز چھیز کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ خشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد، آوارہ وطن، فاماں برباد، تنگ خاندان، عار دو جہان کے حالات سن کے مجھے ہر گز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔ اچھا سنئے اور اچھی طرح سنئے:

باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں استنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچے مکان، کچے جھونپڑے، کچے کھیریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی دیے لوگ ہوں گے۔ کچے بہشتی، نالی، دھوبی، کھار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے ابا، بو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکرتھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی۔ استنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

گھر سے مانگے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا، محلے کی عورتیں خود ہی کنویں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے دروی بہن کر نکلتے تھے، تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں، ہمسایاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی سنجلیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ در حقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا، مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی جسمی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے کچھ ایسا برانہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بچپن کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ سوتوان نہ تھی، مگر تگنی اور پیہ پھری بھی نہ تھی۔ ذیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا، اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائے جامہ چھوٹے چھوٹے پانچوں کلا نول کا نیفہ، نینو کی کرتی، تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی ننھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی اچھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ذرے پڑے تھے۔ سونے کی بابیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیابائی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا، مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپرے پڑے ہوئے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی، انداز کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں نوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادھ کے ڈھیر لگے ہوئے، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جیمز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں تو میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی، اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ وہ! میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر

کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنتا ہے۔ میرا دولہا عید کے دن کس ٹھامہ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا، گلبدن کا پانجامہ، مصالے کی ٹوپی، ٹٹلی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک ہمسینا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی، کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آ سکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی، مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو، مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چندا ڈھیری کیلینے میں جاتا رہا تھا۔ موا چاندی کا تار تھا، شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی، قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی، اس چھلے کے لیے میں اتنا روٹی کہ آنکھیں سوچ گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں بیچیں مار مار کر روتی لگی، بچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انہوں نے مجھے پتکارا، اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھری نہیں چھوائی، اماں ذرا سی بات پر راز پھشتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی، مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دودھ پھر میں نے اسے گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ ادھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا، گود میں اٹھایا، پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ روتے لگا۔ اس پر اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھر کیا دینے۔

یہ سب کچھ تھا، مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے ٹکویڈ منگاتی ہیں۔

میرے جیمز کے لیے اپنے گلے کا سب گھنٹا تار کے ابا کے حوالے کیا کہ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوادو۔ دو ایک عدد جوئے بنے ہوئے ہیں ان کو ابلوادو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے، باقی نکال کے علیحدہ کر دیے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا ”اودہ جی ہو گا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہے، وہ بھی تو بائیں کہ بھائی نے

لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں، سسرال کا نام برا ہوتا ہے، میری لڑکی تنگی بوجی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔“

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود تھپاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوش و خروش کا سبب

ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رندیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے، کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں، بہن جس کو دیکھتی ہیں، اسی حالت میں ہے، مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں، استثنای کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی، اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کم بخت، ادااتی تھی، شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی، نکل کھڑی ہوئیں۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ مگر مجھ بد نصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جھنگ میں چھوڑ دیا جہاں سوائے گم راہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں، جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا، مواذکیٹوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ اب اسے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد میں یہ گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ ابا بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گرائی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا ”دل جمعدار! تم

سچ چ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟“ ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کہنے اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے لبا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے لبا کا ایک کبوتر اڑایا۔ لینے گئے، نہ دیا۔ چار آنے دیتے تھے، وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ لبا تو نوکری پر چلے گئے، جھٹ پنے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی، دیکھتی کیا ہوں اہلی کے بیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا ”چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے، کبوتر لے لو۔“ میں اس کے دام میں آگئی، ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں، گھر میں کانی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چٹخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دی۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا مجھے زمین پر بیٹھا کے آپ گیا، وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا۔ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا، کوئی بس نہیں۔ موڈی کے جھنگل میں ہوں۔ دلاور خاں۔ پہلی کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ مونے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سنائے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، دم نکلا جاتا تھا۔

آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا تھا ہائے کس آفت میں پھنسی۔ لبا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم۔ بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، مکان کا دالان، انگنائی، بادری خانہ، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کنبے کے پار ہوگی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا، مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بت بت پر گھایاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں۔ دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا۔۔۔ تلملاتا پھر تا ہو گا۔

پیر بخش۔۔۔ بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں

تغیر ہونے؟

دلادور خاں:- پورے بارہ برس ہوئے بھائی! لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں، خیر۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کو تو کوئی دن کو یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا دار تھا، میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش:- کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلادور خاں:- تم سمجھتے کیا ہو، جان۔ بے نہ مارا ہو تو پٹھان کا ختم نہیں۔

پیر بخش:- بھئی تم قول کے سچے ہو، جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلادور خاں:- دیکھنا!

پیر بخش:- اور اسے کیا کر دے؟

دلادور خاں:- کریں گے کیا، یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے، دل میں ایک دھچکا سا ہونچا

منکا ڈھل گیا، ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کر بھی موئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونٹہ زور سے

میرے گلجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش:- اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلادور خاں:- گلے گلے پانی۔

پیر بخش:- کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلادور خاں:- گھر تو چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بچ کر دے دوں گا۔

پیر بخش:- تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں؟

دلادور خاں:- کہو۔

پیر بخش:- اماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھو کری کے کوزے کر دو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا، مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی

نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی یہ بات سن کے میرے

دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار

ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلادور خاں:- اچھا دیکھا جائے گا، ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش:- یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں؟ وہ درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے، تھوڑی آگ لے آئیں

تو حہ بھریں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر

دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اک بارگی زور سے چٹخ ماری۔ چٹخ کا مارنا تھا کہ دلادور خاں نے دو جین

ٹما نچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرام زادی! چپ نہیں رہتی۔ ابھی پھری بھونک دوں

گا۔ فیل کرتی ہے۔۔۔۔"

پیر بخش:- (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہو گا) نہیں بھئی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا، تمہیں ہمارے سر کی قسم

! اماں ہمیں تو آلینے دو۔

دلادور خاں:- اچھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حہ بھرا، دلادور خاں کو دیا۔

دلادور خاں:- (ایک کش جھٹکا پانی کس تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں

پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش:- اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں! پکڑے گا کون؟ لکھنؤ

میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سارے کو جانتے ہو؟

دلادور خاں:- کریم؟

پیر بخش:- ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے۔ پیسوں لڑکے لڑکیاں پکڑے گیا، لکھنؤ میں جا کے دام

کھرے کر لیے۔

دلادور خاں:- آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش:- کہاں ہے؟ لکھنؤ میں ہو گا۔ گومتی اس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہو گا۔

دلادور خاں:- بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش:- جیسی صورت ہوئی۔

دلادور خاں:- بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش:- سو ڈیڑھ سو، جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلادور خاں:- بھائی کی باتیں! سو ڈیڑھ سو! اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو جی ملیں تو بہت ہے۔

پیر بخش:- اچھا اس سے کیا ہے، لے تو چلو، مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلادور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر

(2)

دے پھرنے کی اجازت صیاد
شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی! مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر تو اپنی سزا کو پہنچا، مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی؟ موئے کی بوئیاں کات کات کے چیل کودوں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے، اور قیامت کے دن چاہے گا تو اس سے بدتر درجہ ہو گا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہو گا! کیسے تیری جان کو کھپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! اتنی آج کی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امندا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب پیچیں مار مار کے روؤں۔۔۔۔۔

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبانا لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاهی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اس کو بھی ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے، ماشاء اللہ چودہ پندرہ برس کا، دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی، فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا رستہ تھا، مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے، نہ معلوم کن تہہ راستوں سے لایا کہ کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے، مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے دیں لیے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا نام گھر میں سنا کرتی تھی، کیوں کہ میرے نانا۔ بہن کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گو متی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان اور کریم کی ساس موئی مردے شونی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے

بخش نے جواب دیا: ”وہ تو ہم سمجھے ہی تھے، تم کیا ایسے بے وقوف ہو۔“

رات بھر گاڑی چلائی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ رات سلب ہو گئی تھی، بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کھل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چو نک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کھل سر کا کے جو دیکھا، معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا، سامنے کچھ کچے کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ فرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسا کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے مجھ کو دیے۔ رات بھر کی بھوکی تھی، کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لٹا پانی لائے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا، پھر چپکی ہو کے پڑی رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے، دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا، گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی پھرتی نکلی، نہ مجھ پر گھونسے پڑے، نہ گھر کیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے، باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے، کچھ گلے لگے۔ ایک گاتا ہے، دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے، سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی، آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی سے کود پڑتا ہے، دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے، بات رفت گزشت ہوئی، ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک۔۔۔ ہمارے تمہارے لڑائی ہی کیا! بات کی بات تھی۔

دوسرا۔۔۔ بات ہی کیا تھی؟

پہلا۔۔۔ اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا۔۔۔ جانے دو۔

ایک بازار پھر ملا، اس سے نکل کے ایک تینک گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا، پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی بھیڑیں تھیں۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچے۔

مرزا سوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی، یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی، جو کچھ دنیا میں ملتا تھا ملا، یعنی غلام جان کا مکان۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینے پر سے چڑھ کر ادا پر گئی۔ مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے دہنی طرف ایک وسیع کمرے میں غلام جان کے پاس گئی۔

غلام صاحب کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شان دار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا، مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں، مگر ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا کیسا باریک چٹنا ہوا کہ شاید واید۔ اددے مشروع کا پائے جامہ بڑے بڑے پانچے۔ ہاتھوں میں مونے مونے سونے کے کڑے کلاسیوں میں پھنسنے ہوئے، کانوں میں سادی دو دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو ہوا نمی کا سا تھا، مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت غلام کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پانگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں، کنول روشن ہے۔ بڑا سا نقش پان دان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ چٹوان پنی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی بسم اللہ جان ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

”غلام جان، یہی چھو کر رہی ہے؟“

دلاور خان:- جی ہاں!

مجھے پاس بلایا، ہنکار کے، بتایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

غلام:- اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے، اور دوسری چھو کر کیا ہوئی؟

پیر بخش:- اس کا تو معاملہ ہو گیا۔

غلام:- کتنے پر؟

پیر بخش:- دو سو پر۔

غلام:- اچھا خیر، کہاں ہوا؟

لکھنؤ پہنچی تھی، وہ پہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین بچیاں اور ایک لڑکی کے پیالے میں چمچ بھر ماش کی دال اور پانی کی ایک بدھنی میرے آگے رکھ کر چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چینیے اور ستوڑوں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدمی بدھنی بھر پانی پنی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا، کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آگئی۔ تیسری چوٹ بھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی، بڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس، ڈائن کی شکل بکتری بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ گئی۔

”لو نڈیا کتنا سوتی ہے۔ رات کو چیتے چیتے کھا پڑ گیا۔ جھجھوڑ جھجھوڑ کے اٹھایا، سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی تھی سانپ سونگہ گیا۔ اے لودہ پھراٹھ بیٹھی۔“

میں چپکے سناکی۔ جب خوب بک جھک چکی تو پوچھنے لگی ”پیالہ کہاں ہے؟“ میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکل۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ لڑکی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی، اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آگے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے، تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی، اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی چٹکو پہکو روتی رہتی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔ کسی بیٹے کی لڑکی تھی، رام دئی نام تھا۔ سیتاپور کے پاس کوئی گاؤں تھا، وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا، میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری، بہت خوب صورت ناک نقشہ، ذیل ذرا چھریا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خان اور پیر بخش نے آگے مجھے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان سا ملا، پھر ایک بازار میں سے ہو کے گزرے۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپتی جاتی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد

پیر بخش:- ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحب زادے کے واسطے مول لیا ہے۔
 خانم:- صورت شکل کی اچھی ہے، اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی۔
 پیر بخش:- میں کیا کروں، میں نے بہت سمجھایا، میرے سارے نے نہ مانا۔
 دلاور خان:- صورت تو اس کی بھی اچھی ہے، آگے آپ کی پسند۔
 خانم:- خیر آدمی کا بچہ ہے۔
 دلاور خان:- اچھا، جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔
 خانم:- اچھا، تمہاری ہی ضد سہی۔

یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی اور عیرو عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔
 خانم:- حسینی!
 حسینی:- خانم صاحب!
 خانم:- صندوقچہ لاؤ۔
 حسینی گئی، صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے (دلاور خان کے سامنے رکھ دیے) (بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے تھے)۔ ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے۔ (مناسبت سے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خان مردوے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں، بوا حسینی ہیں اور میں ہوں۔
 خانم:- (حسینی سے) حسینی! یہ چھو کر آستے داموں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟
 حسینی:- مہنگی! میں کہتی ہوں سستی۔
 خانم:- سستی بھی نہیں ہے، خیر ہو گا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔
 ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہو گا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موڈوں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا! آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔
 خانم صاحب:- یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں! بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں؟

خانم:- سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے، سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا، سمجھوں سے داغ داغ کے مار ڈالا۔

حسینی:- دنیا میں جو چاہیں کر لیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہو گا۔
 خانم جان:- منہ کالا ہو گا! جہنم کے کندے پڑیں گے۔
 حسینی:- خوب ہو گا، مویوں کی یہی سزا ہے۔
 اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔
 ”بیوی یہ چھو کر تو مجھے دے دیجیے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے، خدمت میں کروں گی۔“
 خانم:- تمہی پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں، اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں، مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔
 حسینی:- بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟
 میں:- (رد کے) بھگتے سے۔
 حسینی:- (خانم سے) بھگتے کہاں ہے؟
 خانم:- اے بے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بھگتے بھی کہتے ہیں۔
 حسینی:- (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟
 میں:- محمدار۔
 خانم:- تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے، ابھی بچہ ہے۔
 حسینی:- اچھا تمہارا نام کیا ہے؟
 میں:- امیران۔
 خانم:- بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں، ہم تو امراؤ کہہ کر پکاریں گے۔
 حسینی:- سنا بچی! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی ”امراؤ“ تم کہنا ”جی“۔

اس دن سے امراؤ میرا نام ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی، لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔ خانم صاحب مرتے دم تک ”امراؤ“ کہا کیں۔ بوا حسینی ”امراؤ صاحب“ کہتی تھیں۔
 اس کے بعد بوا حسینی اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں۔ منہ ہاتھ دھلایا، اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابانو کر رہی ہوں، میں، مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے، چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈیاں نکال کر دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں،

جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں، اماں باورہجی خانے میں ہیں اتنے میں جواہر کو دیکھ دوڑ کے پٹ گئی۔ رورو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔ خواب میں استارو کی کہ چکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے ہشیار کیا۔ آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتی ہوں، نہ وہ گھر ہے نہ دالان، ابابا، نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رورہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے بھی آنسو برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ اور بھولتی نہ تو کرتی کیا! ادلی تو مجبوری، دوسرے نئے ڈھنگ، نئے رنگ۔ اچھا سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ڈانٹے سے بھی میں آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کیلئے کو۔ دن رات ناز گانا، جلسے، تماشے، میلے، باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کنٹرول کی تھی کہ بہت ہی جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا، مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر۔ یہیں تیر کرنا ہے۔

جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں، بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں ان موئے ذکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھاتی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی، اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف 40 کوس ہے، مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہاء دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔

(3)

اک حال میں انسان کی بسر ہو نہیں سکتی

اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہو گا، کس قدر وسیع تھا کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی لڑکیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی

ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی، تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے، وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان کیا تھا، ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جاتکلو، سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چرچانہ تھا۔ اگرچہ میں کم سن تھی، مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے، اپنے مطلب کی سب سمجھتی تھی۔

بسم اللہ اور خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بہ خود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصے میں میری تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن موسیقی کے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے استائی شروع کرادی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر، بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلاتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کو مل سے ات کو مل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیور تر ہو جائے۔ اور میری بھی تجہیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ناٹ دیا کرتے تھے۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گارہی تھی، دھیت سدھ لگا گئی۔ استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں استاذ جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم۔۔۔ جھلا استاد جی، یہ کیا تھا؟ رام کلی میں اوچار دھیت سے ہے اور وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیت کو مل ہے یا سدھ؟

استاد۔۔۔ کو مل۔

خانم۔۔۔ اور چھو کری نے کیا کہا تھا؟

استاد۔۔۔ سدھ۔

خانم۔۔۔ پھر آپ نے نو کا کیوں نہیں؟

استاد۔۔۔ کچھ مجھے خیال نہ رہا۔

خانم۔۔۔ واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گنگنیاں

بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھو کریوں کو تعلیم دیے ہیں؟ ابھی کسی سمجھ دار کے

ماتے سے اس طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس دقت اور بہت ہی خفیف ہوئے، چپ ہو رہے، مگر دل میں بات لیے رہے۔ استاد جی اپنے کونانک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گاری ہوئی، خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا ”گندھار اس میں کومل ہے یا ات کومل؟“

استاد جی:- ات کومل۔

خانم:- خان صاحب! ماثار اللہ! یہ میرے ماتے!

استاد جی:- کیوں؟

خانم:- اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں ”کیوں؟“ سوہا میں گندھارات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔

استاد جی:- گندھار کومل کوات کومل لگا گئے۔

خانم:- بس آپ ہی قائل ہو جیے۔ خود آپ ”کومل“ کہیں اور چھو کری کو ”ات کومل“۔ یا تو آپ چھو کری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کہتے ہیں۔ خان صاحب! میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے چاہے نہ ادا ہو، مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا؟ میں بھی ایسے دیے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے، نہیں تو معاف کیجیے۔ میں کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔ چھو کریوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد جی:- بہت خوب!

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے، قسما قسمی ہو کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ مجھے عمر بھر حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی، کسوں کہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں، استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے یا جان بوجھ کے نہ بتاتے تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی، مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہو یا میں سمجھتی کہ استاد جی نالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی

تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی، مگر یہ ٹھہری کے سوا کچھ نہ آیا، اس پر بھی لے سے ہانوں رہیں۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی، گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ ان کا مبرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گلے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گلے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نو جیوں میں بیگا جان گلے میں فرو تھیں، مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے اٹا تو، اس پر میچک کے داغ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے۔ لال لال آنکھیں، بھدی ناک بیچ میں سے پکھنی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹ، بڑے بڑے دانت، فرہ انتہا سے زیادہ، اس پر ٹھٹھٹھنا۔ بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کہتے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھیں۔ مورچمنان ہی کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی، مارے فرمائشوں کے وق کر دیتی تھی۔

میں:- باجی! ہاں ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا:- سنو، سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔

میں:- میں یہ نہیں مانتی، سر تیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔

بیگا:- لڑکی! تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے کیوں نہیں پوچھتی؟

میں:- اللہ! باجی تمھی بتا دو۔

بیگا:- سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی دیکھ بائیں ہوئیں؟

میں:- (شرارت سے) ادنیٰ، میں نے نہیں گنیں، پھر کہو۔

بیگا:- جا اب نہیں کہتی۔

میں:- واہ! میں تو کہو اگر چھوڑوں گی۔

بیگا:- پھر وہی! کہہ دیا، لے اب نہ سنا۔

میں:- ہاں اب کی گنیں، ”نی“ میں دو ہیں نا؟

بیگا:- ہاں دو۔

میں:- تو ٹھیک بائیں ہوئیں۔ اب تینوں گرام کہہ دو۔

بیگا:- لے اب ٹھیلے، کل آئیے گا۔

میں:- اچھا تنبورہ اٹھالاؤں، کچھ گاؤں۔

بیگا:- کیا گاؤں؟

میں۔ دھڑاسری۔

بیگا۔ کیا گاؤں؟ استائی، دھرپد، تراندہ؟

میں۔ اللہ! باجی دھرپد گاؤ۔

بیگا۔ لے سن۔

”تن کی تپ، تب ہی مٹے جب پیارے کو درشت بھر دیکھوں گی۔ جب درشن پاؤں گی ان کا تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی!۔ اٹھ جام دھیان موہے وا کو رہمت ہے رہے نا جانوں کب درشن ٹھیوں گی جو کو ہو پر بھو پیارے سے ملا دے وا کے پائوں میں سس ٹیکوں گی غنم جان کی نوہ جیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی، ہر دق کی جریب، چاندی کی شام، بہت ہی نفیس ڈیڑھ خیمہ، افیون کی ڈبیا، پیالی، غرضیکہ جملہ تبرکات آج تک نفیر میں ہیں۔ کیا ستر مذاق تھا! دماغ دار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا آج تک اسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڑھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر خدا کے دیے گاؤں گراؤں، مکان بیوی، جوان لڑکے لڑکیاں، سب کچھ موجود تھا، مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے، یہیں کے ہو رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو۔ یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ روپیہ بھی آیا کرتا تھا۔ دس روپے غنم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے، حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویل دار بھی بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوادیتی تھیں۔ غنم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں، بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمے لی تھی، اس لیے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے، پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندہ ناتراش کو انہوں نے آدمی بنادیا۔ یہ ان ہی کی

جوٹیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر رئیس کی محفل میں گئی، حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ ان ہی کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی، شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا، اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریا، ماقبلا، محمود نامہ صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی، فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا، خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں، اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

(4)

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح

مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا۔ حد کاشریر اور بد ذات۔ سب لڑکیوں کو چھپا کر تا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی، اس کے کان دکھا دیے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی، کہیں کتاب پر دوات السد دی۔ غرض اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے، مگر وہ اپنی آبی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری گت بناتا تھا، کیوں کہ میں سب سے انہی اور گینگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے بھی مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے اکثر مار پٹوائی، مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں ہی چغلیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو اس بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔ نواب ساغان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازے میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ذومنی سے رسم تھا۔ انہی سے یہ

لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی، مگر دس روپے ماہ بہ ماہ لڑکے کی پرورش کے لیے دیے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں، وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپن ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا، کسی کی کنکلیا چھین لی، کسی کی مرغی کی ٹانگیں توڑ دیں، کسی لڑکے سے چرکوڑوں کا پختہ دیکھنے کو مانگا، اس نے دے دیا، آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی، سب چرکے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دینے لگے۔ آخر ماں نے عاجز ہو کر محلے کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی، ایک لڑکے کی جوتی کنوئیں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے، حضرت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں تیرا دیا، خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں سے مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب ہی مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا، اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کے کہا ”لو صاحب اپنا لڑکا، ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔“ یہ کہہ کر مولوی صاحب تو ادھر گئے، گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے قیشی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ تھیں نہیں، مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی:- اے ہے مولوی کا ہے کو، موافقتی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اے لو، کان بھی تو بولہاں کر دیئے۔ نابی بی، ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چکار کے دلار کے پڑھاتے ہیں۔

بنو نے چھوٹے ہی کہا ”پھر بوا حسینی، اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔“

بوا حسینی:- لے تو جاؤں، مگر بہت دور ہے۔

بنو:- تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی، شام کو بلوایا کروں گی۔

بوا حسینی:- اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا، اس لیے کہ بوا حسینی کو اپنے حسن خدمت پر پورا بھروسہ تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی، لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مٹھی کو سٹاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کاغل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا، مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میری اس کی صلح ہو گئی، یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خور ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہو گا۔ شاید وہ مجھ سے دوا یک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں، میرا سن کوئی تیرہ برس ہو گا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرہواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مرزا آنے لگا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی (ڈومنی کالا تھا) قدرتی لے دار۔ بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھرکتی تھی۔ ادھر میں لے سرے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسہ ہوتا تھا۔ میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گارہا ہے، میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی، کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو امیر جان یاد تو ہوں گی؟

رسوا:- یاد ہیں، کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب وہ مفتقر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں، اللہ رے جو بن کے ٹھاٹھ! وہ ٹھٹھی ہوئی جوانی!

کھلتی	دہ	چمپی	رنگت
بھولی	بھالی	موسنی	صورت
بانکی	بانکی	ادائیں	ربا
ترجی	ترجی	تکائیں	قہر

بوٹا سا قد، چہرہ ابدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں!

رسوا:- اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے، انگلی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت

ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ:- کہاں دیکھا تھا؟

رسوا:- انہی کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے ایک شاہ صاحب گیر دے کپڑے

پہنے، ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا اس کو سلام کر

لیتے تھے، کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ:- سمجھ گئی! وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا:- جی ہاں، کیا میں نہیں جانتا!

امراؤ:- اچھا تو اب وہیں رہتی ہیں؟

رسوا:- ان کی مصاحبت میں ہیں۔

امراؤ:- اور ان کا حال کیا ہے؟

رسوا:- وہ ایک حکیم صاحب پر مرقی ہیں۔

امراؤ:- کون حکیم صاحب؟

رسوا:- آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتا دوں گا تب بھی آپ نہیں سمجھیں گی، پھر کیا فائدہ؟

امراؤ:- خیر کچھ بتا دیجیے، میں سمجھ جاؤں گی۔

رسوا:- وہ نحاس۔۔۔۔۔

امراؤ:- خوب جانتی ہوں۔ یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے

کی آرزو کرتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے دیسے کا تو ذکر ہی کیا ہے، اچھے

اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھانڈے بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مہریاں ساتھ۔ ایک گڑ

گڑی لیے ہے، ایک کے ہاتھ میں ہنکھیا ہے، ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت

گار در دیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

امیر جان، گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا جانتی نہیں تھیں، مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔

گوہر مرزا بچپن ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار

کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا، مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا۔ اس پر نمک اور

جامہ زیبی، شوخی، شرارت کوئی بات۔۔۔۔۔!

رسوا:- کیوں نہ ہو، کس ماں کا بیٹا تھا!

امراؤ:- اہا! تو کیا آپ نے بنو کو بھی دیکھا تھا؟

رسوا:- (مسکراتے ہوئے) جی ہاں، آپ یہی قیاس کر لیجیے۔

امراؤ:- مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا درپردہ ہوتے ہیں!

رسوا:- خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔

امراؤ:- تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگزشت کو آگ لگائیے۔

رسوا:- مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے، آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراؤ:- دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنئے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے

کہیں کھسک جائے۔ اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے۔ اس وقت ہم کو فرصت ملتی

تھی۔ پھر ایک ایک کمرہ اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں

بن کے ہاں۔ پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات، میوہ مٹھائیاں، حقہ پان۔

رسوا:- آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراؤ:- جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی، شوقیہ پیتی تھی، پھر تو نگوڑی

لت ہو گئی۔

رسوا:- گوہر مرزا صاحب تو چند بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی

ہو؟

امراؤ:- خدا نے اس سے تو آج تک بچایا، مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی

ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی، آئے دن زکام رہتا تھا۔

حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ، کھانے لگی۔

رسوا:- اور وہ چیز نزلے کو روکنے والی؟

امراؤ:- اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا:- کیا تائب ہو گئیں؟

امراؤ:- مدت سے۔

رسوا:- واقعی کیا بری چیز ہے، اپنا تو یہ حال ہے:

بعد تو بہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی

دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ:- ہائے کیا شعر کہا ہے! مرزا صاحب! قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں، پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا:- آپ بھی شغل کیجیے گا؟

امراؤ:- توبہ!

رسوا:- توبہ!

اب بھی ہے، ہوائے سرد بھی ہے

پھر وہ یادش بخیر، یاد آئی

امراؤ:- بس اب طبیعت کو روکیے، جمائیاں آنے لگیں، اللہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا:- جانے دیجیے۔

امراؤ:- مذاق سے بھی معاف رکھیے:

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو

یاد آئی تو خیر یاد آئی!

رسوا:- واللہ امراؤ جان، کیا شعر ہے!

امراؤ:- تسلیم۔

دیکھ کے مشہد ادا ان کو

لالہ و گل کی سیر یاد آئی!

رسوا:- ماشاء اللہ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو، عالم شباب کے ذکر کی تاثیر ہے۔

امراؤ:- جی نہیں، شراب کے ذکر کی تاثیر ہے:

زاهدو! آج ہم کو پھر وہ شے

جس سے ہے تم کو بیر، یاد آئی

رسوا:- آہا بابا! کیا قافیہ نکالا ہے، اور کہا بھی خوب ہے!

کعبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ

پھر وہی وہ دیر یاد آئی

رسوا:- اے کیا کہنا! یہ ”کعبے سے پھر کے“ کیا خوب کہا ہے!

امراؤ:- مرزا صاحب! اے مطلع نہ کر دیجیے۔

پھر کے کعبے سے سیر یاد آئی

پھر ہمیں راہ دیر یاد آئی

رسوا:- خاصہ۔

روش وحشی و طیر یاد آئی

دشت دشت کی سیر یاد آئی

رسوا:- یہ مطلع بھی برا نہیں ہے۔

امراؤ:- یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے

کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسوا:- میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجیے۔

ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو!

یہ سب تو ہو، مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ:- واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل ہی مردہ کر دیا۔ خیر آدم برسر مطلب۔ اسی طرح سے

کئی برس میری زندگی کے غنم کے مکان پر گزرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ

نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے

ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے ٹٹائی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔

دلارام کی بارہ درہی اس جلے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر

کی رنڈیاں، ڈدم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب ہی تو تھے۔ دور دور سے ڈیرہ دار

طوائف بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نائی گویے دلی سے آئے تھے۔ سات دن رات

گانے بجانے کی صحبت رہی۔ غنم نے جیسا دل کھول کے مجھے تقسیم کیے ہیں اس کا

آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ، غنم کی اکلوتی لڑکی تھی، جو کچھ نہ ہو تا کم تھا۔ نواب چھبن

صاحب نے اپنی دادی نواب عمدة الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کم سن نواب زادہ

تھا۔ غنم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا، بے چارہ بھنس ہی تو گیا۔ بچپن میں

ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلعے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، ان کا میری زبان سے نکالنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں، مگر اس بے باکی کا ایک زمانہ خاص ہوتا ہے۔ سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں، سن سے اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں بھی عورت ذات ہیں، ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟

کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ فائدہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے۔

امراؤ! تو کیا پڑھنے لکھنے سے آنکھوں کا پانی دھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی!

رسوا! اچھا اچھا تو آپ کہیے، فضول باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔

امراؤ! کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا۔

رسوا! اور آپ کیا سمجھتی ہیں؟

امراؤ! ہائے فضیلت! توبہ کیجیے، یہ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا! خیر اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی مباحث نہیں:

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتنا کہ تم

چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ! نوج آپ سے کوئی محبت کرے!

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو

بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

رسوا! کس کا شعر ہے؟

امراؤ! یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟

رسوا! ہاں سمجھا۔ تو یہ کہیے کہ آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

امراؤ!

جاتے ہیں جان بچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ صن کا سودا کیے بغیر
اور وہ شریاد ہے تقاضا کیے بغیر؟

رسوا!

امراؤ!

دعہ ہو یا کہ قول، وہ ایسے ہیں نا دہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر
اور کوئی شریاد ہے؟

رسوا!

امراؤ! اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔

رسوا! یہ تو بہت بڑی غزل تھی، دیکھنا کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراؤ! انھی سے نہ منگواؤ؟

رسوا! خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے۔ وہ تو ہرگز نہ لکھیں گے۔

امراؤ! یہ بھی کوئی بات ہے؟

رسوا! جی ہاں، آپ کو نہیں معلوم۔ مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔

امراؤ! اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا:

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں

باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر

اور سنئے۔

غیر دل کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ

چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

میری بھی غزل اسی طرح میں تھی، مگر خدا جانے کیا ہوئی، صرف مقطع یاد رہ گیا تھا۔

رسوا!

امراؤ!

رسوا!

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتنا کہ تم

تکابوں میں حیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سجادیے گئے تھے۔ نواز کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری پاندنی کھنچی ہوئی، بڑے بڑے نقش پاندان، مقابلے، حسن دان، فاصدان، اگلدان اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر حلبی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، پھت میں پھت گیریاں لگی ہوئی، جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، ادھر ادھر بانڈیاں۔ سرشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دودھ مہریاں، دودھ خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگری منہ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پاندان کھلا ہوا ہے، ایک ایک کوپان لگا کے دیتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں پچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ جو بے انہی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے، مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجہ نکال نکال کے دیے جاتے ہیں۔ کوئی دل ہمتیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی نہیں قبول ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ بہشت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے، مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کھجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں رونمھی جاتی ہیں، لوگ منہ رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کمر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ مفضل بھر میں سب کی نگاہیں ان کی طرف ہیں، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر ہی سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے رے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ دل میں کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی سچ ہے، یہ بھی سچ ہے، فقط بناوٹ۔ اگر وہ بے چارہ اکرا فریب میں آگیا، پھر کیا تھا، پہلے بظاہر خود مرنے لگیں:

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے
میں ان کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کھجے میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ قنطری یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر
واقعی خوب کہا ہے! مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف دیا۔
تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔
لوگ خواہ مخواہ اپنے اپنے اچھے خاتمے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میرا نام نہیں جانتے، نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں، مگر میں تو خوش ہوں، اس لیے کہ انگریزی رسم کے مطابق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہو گا۔

لے اب نالیے نا، جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔
کیا زبردستی ہے؟ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔
بیاد براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی!
آپ کے لکھنؤ میں تو رندیاں گالیاں نہیں گاتیں، ڈومیاں البتہ گاتی ہیں، وہ بھی غورتوں میں۔ دیہات کی رندیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔ واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات، یہ رسم تو کچھ اچھا نہیں ہے۔
آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے، اچھے اچھے شریف مرد آدمی غورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں اپنی جارہی ہیں اور یہ خوش ہیں، باجیس کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کو جو بے ہودگیاں با عصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی فحش سے خالی نہیں۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے، آپ بیٹی کیجیے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔
آپ نہ مانے گا، لے سنیے۔

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی، خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہو گئی، آزادی کا ظمت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں ان کی

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں، مگر یہ کرشمے دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی، ان کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں، اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں، نہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جو در دیوار سے لے کر پھٹ تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف اس کوٹھری میں چولہا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو بدقلعی سی پتیلیاں، لگن، توار، کابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آنے کی منکلی رکھی رہتی تھی۔ اس کے اوپر دو تین دالیں، نمک، مصالحہ ہانڈیوں میں، اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختے، مصالحہ پیسنے کی سل، بٹا۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ۔ یہیں تھا۔ چولے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں، کھانا پکاتے وقت اس پر پرانگ رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت کی بتی پڑی ہے۔ مواندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ آکڑاؤ، لو ادھچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو پھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن، دال کی پتیلی، چپاتیاں، مولوی صاحب کے واسطے ڈھانک کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا پھینکا تو چولے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا، جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تو سالن کی یہ پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔ صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں، اور شام سے نو بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور سارنگی کے گزوں کی مار۔ یہ ہمارا پیارا اخلاص تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا، اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی، بلکہ اردوں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا:- تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو، اس وقت تو اور بھی جو بن ہو گا۔

امرؤ:- تسلیم! خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجیے، بالکل بے محل اور بے موقع ہے، معاف

کچیے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا:- یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کی آپ کی طرف توجہ نہ ہو، نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی، مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مٹی نہیں ہوئی تھی۔ غلام سے لوگ ڈرتے تھے اس لیے آپ سے کوئی نہ بولتا ہو گا۔

امرؤ:- شاید یہی ہو، مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی "بی دولتی اپنے تیبے میں آپ کھولتی" اپنی بھجوسیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی، کھانا پینا حرام تھا، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی چوٹی کا شوق ہوا۔ کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا، اس لیے کہ کوئی چوٹی گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے، میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا؟ وہی بوا حسینی، وہ بھی جب انھیں فرصت ہوئی، نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں، سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں دن میں تین جوڑے بدلتی تھیں، یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کار چوٹی جوڑے پہنتی تھیں، یہاں وہی گھبڈن کا پاجامہ، ململ کا دوپٹا، بڑی بڑائی ہوئی لچکے کی تیلی دے دی گئی۔

اس پر بھڑک پڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس، مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانے سے اٹھادی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزیداریوں کا خیال تھا، مجھے کون بیٹھنے دیتا!

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھیکہ دکھا دیا، کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاؤ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھپاتی تھی، وہ مجھے چھپاتا تھا۔ میں اسی کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا، کہیں دو

نارنگیاں حبیب میں پڑی ہیں، مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلواسوہن کی ٹکیہ لینا آیا، مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا، وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس سے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے، مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا، وہ روپیہ بہت دنوں تک میں نے جگور رکھا، اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا، تو کیا بتاؤں گی؟ راز داری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

(5)

ایک شطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاساں کم بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں۔ آسمان پر گھٹنا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اور دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا۔ اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمردن میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گلے کی آواز آرہی ہے، کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں، ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے، دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے، مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے، کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں میری آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ میری گھٹکی بندھ گئی۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ آخر بے ہوش ہو گئی۔۔۔۔۔ صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی۔ وہ کہاں ملتا ہے! خانم منہ تھو تھائے بیٹھی ہیں، بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے، مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا:- یہ نہیں کہیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں۔

امراؤ:- خیر اب حاشیہ نہ چڑھائیے، سنتے جائیے۔

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی

ہے۔

رسوا:- کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔

امراؤ:- امیدیں خاک میں مل گئیں؟ خانم کو آپ نہیں جانتے، ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس

معاملے کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور التیام کی وہ تدبیریں کہیں کہ شاید و باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گناٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہد پھنس ہی گیا۔ ان

دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے طالب علمی کے لیے لکھتو تشریف لائے

تھے۔ گھر سے خوش، والد مرحوم ان کے رشوت نذرانے کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف

بے جا کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر اچھے رہے، پھر جو لکھتو کی ہوا لگی، علم تماش بینی میں

طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے، لکھتو کے

کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہم راہ آئے تھے وہ سب رکمن میاں کہتے تھے۔ لکھتو والوں نے ان کو راجا کا

لقب دیا، مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی اور آپ لکھتو کی وضع قطع پر مر گئے تھے،

اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر

تھی، لکھتو کی ہوا لگتے ہی پہلے کترواں ہوئی، پھر فحشا شاشی اور تھوڑے دنوں کے بعد بالکل صفایا ہو گیا۔

داڑھی منڈانے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بد نما نکل آیا، مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ،

چمک کے داغ، جھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنڈا

ساق، غرض یہ کہ بہ بہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ بہرہ دو آئینہ

سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مردڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے، گھونگر

بنایا گیا، نکلے دار نوپنی سر پر رکھی گئی، اونچی چولی کا انگر کھا ڈانٹا گیا، بڑے پانچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب

ٹھانڈے رنڈیوں کی دربار داری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی، دوسرے لائق اجلباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد

اونچے اونچے کمردن پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی، بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھنن جان سے مادر پدر ہوتا ہے،

لیکن نیپیں لگاتی ہیں، حسانے جو تا کھنچ مارا آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا، مگر

ناکھاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا، اس کی ناکھ کو محج

عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مملکت یہ بھی

تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سرشام سے دو تین گھنٹہ رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ ان کی ہر ایک فوجی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے، خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھامنے سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب ہی بنایا تھا۔ آپ کے اشار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریا لے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی، تمام مشاعرہ چونک گیا۔ رستخیز گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنسنے ہنسنے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے، آپ خوش ہوتے تھے، جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے، مولوی بن کے آئے گا، جو کچھ یہ لکھ بھیجتے تھے، بھیج دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے بے فکر، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خور آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انھی لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنڈا کیا۔ خانم کا یہ کہنا "ناصاحب! ابھی وہ کم سن ہے" اور ان کی التجا، منت و زاری، بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوا۔ اس روپے کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلانے، پانچ سو روپے نذر و نیاز کے نام سے لے مرے۔ خلاصہ یہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے، سو روپے ماہ وار دیتے تھے، فرمائش کا ذکر نہیں۔ جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا، خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں، خدمت کار میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ پھانک کے پاس والا کمرامیرے رہنے کے لیے سجا دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی، شریف زادے میرے پاس بیٹھنے لگے۔

گل چین اول گوہر مرزا مجھ سے ہر زمانے میں برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی، اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں، کوئی پوچھتا نہ تھا، اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر

گیری میرے ذمے ہی تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑ تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا، ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے مجرے میں انھی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کے اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے، یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کہتے ہیں، ہر تال پر واہ واہ کہتے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے، یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے۔ خاطر مدارت اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی، انھی کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے، ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں، نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے، مجھے جانے دیجیے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں، آپ اس طرح کیا نہا بیٹے گا۔"

تماش بین ان سے دبتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی، یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات، بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماش بین ایک طرف، خود نالکے پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو ان کے ساتھ نکل کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرقی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی آثار کے لے گیا۔

ایک دفعہ جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلیہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔

اور دن کا ذکر کیا، خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میرا دلاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میرا صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار تھے، جوان تھے، کسرتی بدن، اچھی اچھیوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غائب تھا، کیا بجاں کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نان شینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپے لگا کے شادی کر دی، مگر رات کی رات کے سوا میرا صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب، کوئی ستر برس کا سن، کمر جھکی ہوئی، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوادیتی تھیں۔ افیم، گناہ، ریویاں، ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے، ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہ فہمائش کہا: ”جاؤ چھو کر یو! نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں! جیسی رنڈیاں وہ سے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں، جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا، ہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیے، ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزر، آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟“ سب نے سر جھکا لیا۔

(6)

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے

یوں تو بسم اللہ کی مٹی میں پہلے پہل ناپچی گئی تھی، مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ درہی کس شان سے سچی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا تھا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے معند، تکتے، سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ درہی بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں اور گھوریوں کی خوشبو سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا ہو گا۔ اس زمانے میں بزدل سے ایک بائی جی

آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوچھیاں گویا نوک زباں تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر وہ خانم صاحب! دائمی کیارنگ محفل دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی، مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کرتی کیا ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکی کارنگ کیسے بے گلا۔

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی۔ مگر اس دقت کی پھرتی، چالاکی، الہزین!

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم

کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا!

گت تھوڑی ہی دیر ناپچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرادی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے

دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ دبلا ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا مطلع

اک ذرا بتا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے

درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے

دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر پر یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہو گا کوئی مجھ سا بدنام

جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

ذرا اس شعر کو سنئے اور قیاس کیجئے عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

عشق میں حسرت دل کا تو لکھنا کیسا

دم نکلنے میں بھی کم بخت مولا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھہ ہمیں چوک گئے

اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل وجد کے عالم میں تھی۔ ہر شخص محفوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ، ہر رسم پر آہا ہا۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گویا گیا، پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔

دوسرے مجرے میں پھر یہی غزل گوائی گئی۔

مرزا رسوا۔ وہ خیر محفل کا جو حال ہوا، از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا

دیکھئے۔ یہ کس کی غزل ہے؟

امراؤ۔ ادنیٰ، کیا آپ نہیں جانتے؟

رسوا۔ میں سمجھا!

امراؤ۔ اور شعر سنئے۔

تاب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے

وہ بھی اس وقت کہ جب شوق ریا ہوتا ہے

رسوا۔ سبحان اللہ!

امراؤ۔ واقعی قلم توڑ دیا ہے!

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شر بار کہوں

ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ بھی خوب کہا ہے!

امراؤ۔ اور سنئے۔

کس قدر محقق حسن مکافات ہوں میں

دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ فلسفہ ہے، اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ۔ اور سنئے۔

شوق انہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ

اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا۔ یہ تصوف ہے، ہم دنیا کے لوگ ہیں، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں، مگر شوق انہار،

یہ لفظیں کیونکر مل جایا کرتی ہیں؟

امراؤ۔ مقطع سنئے۔

ہجر میں نلہ و فریاد سے باز آ

ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

رسوا۔ مطلع سے مقطع نکال لیا ہے، مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراؤ۔ فرصت انہیں کب ملتی ہے۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن شام کو بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں، ایک خدمت گار ان کے

ساتھ تھا۔

بوا حسینی۔ دیکھو امراؤ صاحب! یہ کیا کہتا ہے۔

استنا کہہ کے بوا حسینی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار۔ (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے، جو کل شب کو محفل میں زرد

مندیل سر پر رکھے دو لہا کے داہنی طرف بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ

کے پاس آنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں، اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور اس

غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں۔ نواب صاحب کو میری تسلیات کہنا۔ شام کو جب چاہئے، تشریف لائیے، تحلیہ ہو

جائے گا۔ غزل کے لئے کل دن کو کسی وقت آنہ لکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ غزل کی نقل میں نے

کر رکھی تھی، تحلیہ اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمرے نکال کے مجھے دیں اور کہا کہ

نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لئے میری طرف سے

قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔

اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دے دوں، وہ غام کے

حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا، چمکتی چمکتی نئے گھن کی اشرفیاں بھلا میرے

دل سے کب نکلتی تھیں! اس وقت صندوقچہ دندو قچہ تو میرے پاس نہ تھا پلنگ کے پائے کے نیچے

مرزا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشوونما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طبیعت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین پھینٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپے کے سوا جس کا ذکر کر چکی ہوں، کبھی کچھ نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا جو میری ناز برداری کرے، روپیہ خرچے، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور انہار عشق پسند ہے۔ بیشک پسند ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گہنا تاکتے ہوئے آتے ہیں، جن کے ہر کناٹے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لئے چاہو، اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے، ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ملاگیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھاؤ، ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتی ہے، مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لبلی مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف تھے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یکطرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اس کو عقل دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں

تھے۔ دنیا کے جمل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ انہار عشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی، مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنالیا۔ بہت سی لگاؤ کی باتیں کیں، بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا، کچھ جھوٹ۔ سچ تو اس لئے تھا کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، سوتواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت بتیمی، گھونگر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا تھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی چوڑی کلاسیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھالی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں سے اکثر انہی کی تصنیف تھے۔ شعر پڑھنے میں ہواؤ ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ شاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔ شاعروں کو کیا ہی عاشقانہ شعر ہو، کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھینپ نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں، مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرضیکہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت تھی۔

نواب۔ آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا ہے کہ بغیر آپ کے دیکھے چین ہی نہیں آتا۔
میں۔ یہ سب آپ کی قدر دانی ہے، ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔
”ایاز قدر خود بشناس۔ من آنم کہ من دانم“

نواب۔ اودھ! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں۔ جی ہاں، کچھ شہ بد پڑھا تو ہے۔

نواب۔ اور لکھنا بھی جانتی ہو؟

میں۔ جی ہاں لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب۔ تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے؟

میں مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب۔ واللہ کیا پیارا خط ہے! اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔ خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا، اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے، جہاں تک ہو کسی ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو، نہ یاروں کی شہادت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں راز داران کے ہمیں تم ہو

میں:- یہ آپ ہی کا شعر ہے؟

نواب:- جی نہیں، والد مرحوم نے فرمایا ہے۔

میں:- کیا خوب فرمایا ہے!

نواب:- ماشاء اللہ آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے

حسن تقریر بھی ہو، خوبی تحریر بھی ہو

میں:- کس کا شعر ہے؟

نواب:- ان ہی کا۔

میں:- کیا خوب فرمایا!

نواب:- جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے، مگر والد آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں:- یہ فقط آپ کی عنایت ہے۔

ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب:- واہ کیا صاف صاف شعر ہے!

میں:- تسلیم!

نواب:- یہ کہئے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

میں:- جی نہیں، آپ ایسے قدردانوں سے کہوا لیتی ہوں۔ اس بات پر نواب صاحب پہلے تو

اک ذرا چپ رہ جاتے، پھر مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔

نواب:- خوب کہی! جی ہاں اکثر رنڈیوں کا دستور ہے کہ یاروں سے شعر کہوا کے اپنے نام سے

پڑھا کرتی ہیں۔

میں:- آپ رنڈیوں کو کہئے۔ کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟

نواب:- واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنہوں نے کبھی ایک

مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے

تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے، چھانٹ دیئے۔ میں کہتا ہوں

کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے
بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہو
گی۔

میں:- خدا جانے۔ یہ بھی ایک ہوس ہے اور بڑی ہوس۔

نواب:- اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھئے۔

میں:- فرض ہے ضبط نالہ و فریاد

جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب:- کیا شعر ہے! پھر پڑھئے۔ والد کیا نئی بات کہی ہے!

میں:- (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم! آپ قدردانی کرتے ہیں۔

نواب:- شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھئے۔

میں:- اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دوسرا بھی کہے ہیں۔

نواب:- یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدہہ بہ اور ایسے شعر! اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھئے۔

میں:- اب آپ ارشاد کیجئے۔ اسی لئے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب:- میں پڑھے دیتا ہوں، مگر آپ کو بھی غزل پڑھنا ہوگی۔

اسنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ

رنگت، کمر بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کنار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس

آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف

دیکھا، میں نے سر جھکا لیا۔ کان تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہو گا،

کمرے میں کوئی نہ ہو گا۔ کس مزے کی گفتگو، کیا استہرام مذاق تھا، کیا راز و نیاز ہو رہا تھا، کہاں یہ بلائے

مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

ان صاحب نے بیٹھے ہی نواب صاحب کی طرف گھور گھور کے دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی اپنے

باپ کے قاتل کو دیکھتا ہو۔ گھڑی گھڑی کنار پر ہاتھ جاتا تھا۔ میں تو دل میں سہمی جاتی تھی۔ یا الہی یہ

کیا آفت ناگہانی آگئی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ نواب اپنی طرف کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں، تیوریاں چڑھی

ہوئی ہیں۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی، اس کم بہت نے کیا غل ڈالا۔ نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے،

نکلنے رہے گی۔ یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خان صاحب:- لے اب تمہی گھر کو جاؤ، اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب صاحب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے تھے، مگر داہری شرافت! اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا، مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے، مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا، اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے، مگر اس پاجی کی بد زبانی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے، وہ اور شیر ہو جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب:- اچھا اٹھئے خان صاحب! ہم آپ دونوں یہاں سے چلے جائیں، عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دودو ہاتھ ہو جائیں۔

خان صاحب:- (قہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ! کہیں کوئی چر کا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب:- مردود! اب تیری بد زبائیاں حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی نواب نے وہ لائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طمچہ تھا، دن سے داغ دیا۔ خان صاحب دھم سے گر پڑے، میں سن سی ہو گئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طمچے کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید جان، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہرباں، تو میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیر ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی، نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کر نواب کے ہاتھ سے طمچہ لیا اور کہا ”لے اب حضور گھر تشریف لے جائیں، میں سمجھ لوں گا۔“

نواب:- میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا، ہوا اور جو کچھ ہونا ہو گا، ہو جائے گا۔

شمشیر خاں:- (کمرے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم! ابھی اپنے کلبجے میں مار لوں گا، نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا خان صاحب کے گولی کہاں لگی۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے، بازو میں لگی تھی، اس پار ہو گئی۔

شمشیر خاں:- میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا۔ وہ چوک میں ہی تھے۔ فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے۔

مرزا:- ہو گا! پھینک دو مردود کو کمرے کے بیچے، سمجھ لیا جائے گا۔

خیر، خان صاحب کو کمرے کے بیچے تو نہیں پھینکا، بازو پر پٹی باندھی، ڈولی بلوائی گئی۔ خان صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آگیا تھا۔ مکان کا پتا پوچھ معلوم ہوا مرغ خانے میں رہتے ہیں۔ ڈولی میں بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہا روں کو سمجھا دیا تھا مکان کے قریب کہیں پر اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے، نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہو گئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا بھی۔ وضع دار آدمی تھے، پہلے ہی جب وہ آئے تھے، آدمی کی زبانی پیش تر بہت تاکید تھلنے کے لئے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا۔ مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خان صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے، سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے چار پانچ دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آگیا تھا۔ وہاں نواب صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہونا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیلئے اشارے کئے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا، کوئی نو دس برس کا سن، بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بٹھا تھا کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا تھا، علیحدہ کمرے میں پیشوازا تار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلوایا، پاس بٹھایا، ایک پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں:- سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا:- کون سلطان صاحب؟

میں:- وہ جو دلہا کے پاس تمہارے برابر بیٹھے تھے۔

لڑکا:- (حیوری چڑھا کے) واہ! وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، انہیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں:- اچھا تو ہم کچھ دیں، انہیں دو گے؟

لڑکا:- کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں؟

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے، اس جلسے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن، شب
مہتاب کا عالم، صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاڈ ٹکے لگے ہوئے۔ سالان
عیش و نشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، پیلے جتیلی کی مہک سے دماغ معطر،
خوشبودار گلوریاں، بے ہوئے تھکے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں! ایسے ہی
جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے
جلسے بہت جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے، بلکہ شاید مرنے کے بعد
بھی۔

لذت معصیت عشق نہ پوچھ

خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے
ہوئے تھے کہ عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے
بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین
ہے کہ وہ اسی سبب سے مجھ سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں وہ شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب
دیتی تھی۔ مگر افسوس! فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر

ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

اچھا وہ سب کچھ تو ہوا۔ آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو
گئے ہوں گے۔

امراؤ،

واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے ہیں، یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا،

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر سلامتی سے جہاں آپ نشر و نفاذ لے گئیں، صفائی ہو گئی۔

امراؤ،

آپ جو چاہے کہئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز بیان نہ کرتی۔

خیر اب تو قصور ہوا۔

رسوا،

قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ

میں۔۔۔ غفا نہیں ہوں گے۔

لڑکا۔۔۔ اور ددگی کیا، پان؟

میں۔۔۔ پان نہیں، پان تو ان کے غاص دان میں ہوں گے۔ اے لو، یہ کاغذ دے دینا۔

ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا میں نے اس پر کونسلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب

بزم میں آج ان کو پھیرا چاہئے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا ان کو معلوم ہوگا۔ لڑکے نے
ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا، پڑھا۔
پیلے تو چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے۔
اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔ شمشیر خان کو اشارے سے بلایا، اس کے کان میں کچھ چپکے
سے کہہ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے کمرے میں آیا۔

شمشیر خان۔۔۔ نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں گے۔

دوسرا محراب صبح کو ہوا تھا، اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے
سوئی معلوم ہوتی تھی، گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں جوں مجر ختم ہوا، میں گھر پر آئی۔ اس دن، دن
بھر شمشیر خان کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا، نواب کا رقمہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

”تمہارے شعر نے اس آگ کو، جو میرے دل میں دہی ہوئی تھی، کرید کر بھڑکا دیا، واقعی مجھے تم
سے محبت ہے، مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے
تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں، کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا، ہر شرط فرصت چلی آنا۔ یہی
ایک صورت ملنے کی ہے، وہ بھی نو دس بجے رات تک۔“

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا

یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی غام کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ وار گنج
میں نواب بنے خاں کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا
چرچا ہوا، کبھی نواب بنے صاحب طبلہ بجانے لگے، میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گاتے
تھے۔ تال سم سے تو ایسے واقف نہ تھے، مگر اپنی غزل آپ خوب گالیتے تھے۔

جائے گا۔ خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا ذمہ میں نہیں کرتا۔ اب اس بات کو ہمیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعراور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔

امراؤ۔ آپ بھی آدمی کو خوب بتاتے ہیں۔

رسوا۔ خیر بگاڑتا تو نہیں؟ اچھا آپ شعر پڑھئے۔

امراؤ۔ اچھا سنتے۔ ایک مطلع اور دو شعراور یاد ہیں۔

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریک بزم ماتم ہو گئیں
ہم نشیں! دیکھی نحوست داستان ہجر کی
صحبہیں جھنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خان صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کا کچھلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیقہ، مصالح دار ٹوپی، کاکلیں بنی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گی۔

آپ کہئے گا کہ اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا۔ سنئے مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہو گا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے، وہاں سلامتی منانے کے لئے جلو سیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا۔ پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لئے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئے، نواب بوڑھے ہو گئے تھے، مگر کیا مجال نو سبجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، کھلائی آ کے زبردستی اٹھالے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں، ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہو۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی، مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آپ تو ہنستے ہوں گے۔ مگر میرے دل سے پوچھئے، بیشک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس

بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔ فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال ان کے سامنے کوئی گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو نوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے، سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے، دور دور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی تعزیه داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ امام باڑے میں پٹکے، شیشہ، آلات، جوڑے تھے، نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس دن تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو سبجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی، نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی، انہوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب صاحب بسم اللہ جاننے پر مرے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دیا۔ رکھا تھا، صاف انکار کر دیا۔ مگر انکار کب چلتا تھا۔ شاہی زمانہ، انکی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی، وہ کب مانتے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہیں اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہوں، نواب صاحب طنزورہ چھیڑ رہے ہیں۔ نواب صاحب کے مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خیردار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں، تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سجدہ کو بھی یہی خیال تھا۔ مگر وہ درانا دیوان خانے میں گھسے چلے آئے۔ آ کے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولا ہو گئے۔ خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا، نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب:- خیر اب تعظیم و تکریم کو تو رہنے دیجئے، مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا تھا، ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔

نواب:- ارشاد!

بڑے نواب:- آپ سچے ہیں، آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا، اس وجہ سے آپ عجوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائیداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض و متصرف ہیں۔ بیشک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں، مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائیداد بنا بر اس وصیت نامے کے آپ کو مل سکتی ہے، مگر لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں اور ثلث سے زیادہ کی نسبت آپ سے باز پرس نہ کی جائے گی اس لئے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔ (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آب دیدہ ہو گئے، مگر پھر ضبط کر کے کہا) آپ اس جائیداد پر بدلت النہر قابض و متصرف رہتے، میری ذاتی جائیداد میرے خرچ کے لئے کفالت کرتی ہے اور اس جائیداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے۔ مگر آپ کی بددستی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائیداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لئے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہم راہ ہیں، اسی وقت تمام گھر کا تعلیقہ ہو گا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جائیے۔

نواب:- تو اس جائیداد میں میرا کوئی حق نہیں؟

بڑے نواب:- جی نہیں۔

نواب:- اچھا، ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں؟

بڑے نواب:- وہ آپ لے چکے۔ اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف لے چلئے۔

میرے نزدیک آپ کا ایک حصہ نہیں۔

نواب:- تو اچھا ماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب:- وہ آپ سے دست بردار ہوتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کر بلا جائیں گی۔

نواب:- اچھا تو میں کہاں جاؤں؟

بڑے نواب:- یہ میں کیا جانوں! یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین مشغولہ اور معشوقہ سے دریافت کیجئے۔

نواب:- اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔

بڑے نواب:- اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں آئے، نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈوبیاں کرایہ کیں، چوک کا راستہ لیا، مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستے ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا، راستے میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا اور ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو، نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب، دوست، جاں نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے، تشریف رکھتے ہیں۔ یہ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں، پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے، مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھانڈے سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت اندے دے دے مزاحمت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو:- دیکھو بسم اللہ جان! نواب سے تو اب سے کوئی امید نہ رکھو۔ میں، جو کچھ کہو، وہ دے دیا کروں، غریب آدمی ہوں، زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے، اس کا نصف بھی مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ:- غریب آدمی ہوں؟ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کٹ کٹ کے گھر میں بھری اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نومن چربی سے کم نہ نکلتے۔

حسنو:- ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو۔ وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ:- آپ کی والدہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ دایوں میں تھیں نا؟

میر حسنو۔ (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا تو زیور چھوڑ کر مری ہیں۔

بسم اللہ۔۔ وہ آپ کی بیوی لے کے یار کے ساتھ نکل گئیں، آپ کے پلے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو۔۔ تو والد کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ۔۔ والد آپ کے نواب حسن علی خان کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو۔۔ چڑی ماروں میں؟

بسم اللہ۔۔ اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو۔۔ مرغ بازوں میں تھے؟

بسم اللہ۔۔ اچھا وہ بٹیر باز سہی، تھا تو چڑیا کا کام۔

حسنو۔۔ لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ۔۔ میں کھری کہتی ہوں، اسی سے بری مشہور ہوں۔ اور کہتی بھی نہ، تمہارے چھوڑے پن

پر جی جل گیا۔ یوں تم آتے تھے، میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ

داردات ہوئی، آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ تو کری کا پیغام دے دیا۔ ہوش کی دوا

کرد۔ تم کیا نوکر رکھو گے۔ یہی ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ سہی، بس!

حسنو۔۔ چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

بسم اللہ۔۔ زبان سے؟

حسنو۔۔ یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کی جوڑی کمرے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کام

ہو گا؟

بسم اللہ۔۔ میں دیکھوں؟ (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں مہن لے) کل چھتا

مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی، مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا تو اب آپ تشریف لے جائیے۔

اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے، ٹھہر نہیں سکتی، کل اسی وقت آئیے۔

حسنو۔۔ تو کڑے اتار دیجئے۔

بسم اللہ۔۔ یا اللہ! کوئی چوروں سے بہوار ہے؟ میں تمہارے کڑے کچھ کھانہ لوں گی۔ اس وقت

میرے ہاتھ میں سادی پٹریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں، ان

سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی، اس لئے ذرا ہاتھ میں ڈال لئے، صبح کو لے جانا۔

حسنو۔۔ کڑے دے دیجئے، میرے نہیں ہیں، نہیں تو کیا بات تھی، تم پر سے صدقے کئے تھے۔

بسم اللہ۔۔ تو کیا آپ کی اماں کے ہیں؟ انہوں نے انتقال کیا، پھر بھی آپ کا مال ہے۔

حسنو۔۔ میں نے یوں ہی تمہیں دکھا دیئے تھے، میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ۔۔ جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی

رکھنے کو دیئے تھے۔

حسنو۔۔ لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ۔۔ یہ جب کہ جس دن مہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ مہن امراؤ نے ضد کی کہ

میں پورے سولوں کی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا، میرے سامنے صندوقچہ نکال کے

کڑے پھینک دیئے تھے۔ (پھر میری طرف مخاطب ہو کے) دیکھنا مہن امراؤ، یہ وہی

کڑے ہیں نا؟

میں۔۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو، کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ۔۔ لے خشکا کھائیے۔ اب یہ کڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ یہ ہمارے نواب کے کڑے

ہیں۔ ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو۔۔ لو اچھی کمی! اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں؟

بسم اللہ۔۔ روپے تم کہاں سے لائے؟ وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو۔۔ جی جی! مہاجن سے بیازو (سودی) نہ لاکے دیئے تھے؟

بسم اللہ۔۔ اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے، ہم اس کو روپے دے دیں گے، آپ ٹہلے۔

حسنو۔۔ کڑے تو میں لے کے جاؤں گا۔

بسم اللہ۔۔ میں تو نہ دوں گی۔

حسنو۔۔ تو کچھ زبردستی ہے؟

بسم اللہ۔۔ جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جائیے، نہیں تو۔۔۔۔۔

حسنو۔۔ اچھا تو رہنے دیجئے، کل ہی دے دیجئے گا۔

بسم اللہ۔۔ کل دیکھا جائے گا۔

”دیکھا جائے گا“ بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں صنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جاتے ہی بن پڑی۔ بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے بچانے جب چھین صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت دیا تھا اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا دیا۔ صنو سے اس کڑے کی جوڑی کے لئے جب باز پرس کی گئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گردی نہیں ہوئے۔ اسی سے میاں صنو کی کور دیتی تھی۔

بسم اللہ:- (صنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا۔ بہن، یہ بڑا قابوچی ہے۔ نواب کا گھر اسی موذی نے تمہیں نہیں کیا ہے۔ میں مدت سے اس موئے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دستی ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے۔ چوری کا تو مال ہے۔

میں:- ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو، احسان ہو گا۔
بسم اللہ:- نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے، موئے نے سوادو سو روپے پر ہتھیالی تھی، زیادہ بریں نیست۔ سوادو سو توالے کروں گی۔ دس بیس سود کے سہی۔
میں:- بھلا مہاجن تمہیں کیوں دینے لگا؟

بسم اللہ:- کیا مہاجن! اسی نے روپے دیئے تھے، اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹپھس کریں گے تو ان کو کو توالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پاپیادہ، اکیلے، چہرے پر اداسی چھائی ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ نہ وہ شان و شوکت، نہ وہ رعب داب، نہ وہ بے تکلفی۔ چپکے آ کے اک کنارے بیٹھ رہے۔ سچ کہوں، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ! رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ:- نواب! دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن صنو کو گردی کرنے کو دی تھی؟

نواب:- وہی ہیں۔ وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گردی ہی نہیں ہوئے؟

بسم اللہ:- کتنے پر گردی ہوئے تھے؟

نواب:- یہ تو یاد نہیں، شاید ڈھائی سو یا سوادو سو، کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:- اور سود کیا تھا؟

نواب:- سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گردی ہوئی، پھر اس کے چھڑانے کی نوبت نہیں آئی جو سود کا حساب کیا ہوتا۔

بسم اللہ:- اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب:- لے لو۔

بسم اللہ:- کہو تو میاں صنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب:- نہیں، میرے سر کی قسم! ایسا نہ کرنا، سید ہے۔

بسم اللہ:- سید ہے؟ اس کے باپ کا پتا نہیں؟

نواب:- خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت، کیا کہنا، خاندانی رئیس ہیں نا!

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے، نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔ اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں۔ اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی، خانم صاحب کو جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم:- کہاں سے آئی ہو؟

بوڑھیا:- کیا پتاؤں کہاں سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں؟

خانم:- بوا یہاں کون ہے، میں ہوں اور تم ہو اور یہ چھو کری ہے۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔

بوڑھیا:- مجھے نواب فخر النساء بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

خانم:- کون فخر النساء بیگم صاحب؟

بوڑھیا:- اے لو تم نہیں جانتیں، نواب چھین صاحب۔۔۔۔۔

خانم:- سمجھی، کہو۔

بوڑھیا:- بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی ماں ہیں نا؟

خانم:- ہاں، بات کہو۔

بوڑھیا:- بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھین صاحب میرا کلوتا بیٹا ہے۔ میں ابھی اس پر پروانہ ہوں

اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے، اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے، بچپن کی منگیت۔ لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے۔ چھین نے شادی کرنے سے انکار کر دیا، اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ یہ سب تنبیہ کے لئے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے۔ جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا، اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کر دو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائیداد اسی کی ہے۔ سو اس کے اور ہے کون۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

خانم:- بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، خدا چاہے تو وہی ہو گا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں، مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہو گا، خاطر جمع رکھئے۔

بڑھیا:- مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھین کو اس کی خبر نہ ہو۔ بڑا ضدی لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خانم:- (ماما سے) کیا مجال! (مجھ سے) دیکھو چھو کری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔

جی نہیں۔

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔

ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم:- میری طرف سے عرض کرنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دوا نچھر کان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں، بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں، میں بھی موجود ہوں۔ اتنے میں خانم صاحب خود بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑی ہوئیں۔

خانم:- اے لوگو ہم بھی آویں؟

بسم اللہ:- (نواب سے) ذرا سر کر بیٹھو، اماں آتی ہیں۔

(خانم سے) آئیے۔

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اس طرح مؤدب ہو کر کسی کو سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم:- (نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے؟

نواب:- (گردن جھکا کے) الحمد للہ!

خانم:- خدا خوش رکھے! ہم لوگ تو دعا گو ہیں۔ ہزار بڑھ جائیں، مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مال زادی، آپ کے ہاتھ کو دیکھنے والی۔ آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے۔ اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں۔ یوں تو بسم اللہ، خدا سلامت رکھے! سال بھر سے آپ کی خدمت میں ہیں، مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی، بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں، بسم اللہ جان ان کامنہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ کہتی کیا ہیں۔ میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی۔ نواب کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھپٹی جاتی ہیں، مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم:- تو پھر عرض کروں؟

نواب:- (بہت ہی مشکل سے) کیئے۔

خانم:- (مجھ سے) ذرا بوا حسینی کو بلا لینا۔

میں گئی اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم:- (بوا حسینی سے) بوا ذرا دو شالے کی جوڑی تو اٹھا لانا، وہی جو کل بکنے کو آیا ہے۔

”بکنے کو آیا ہے“ ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا جیسے کسی پر دفعتاً بجلی گر پڑے، مگر بہت ضبط کر کے چپکے سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دو شالہ لے آئیں۔ کیا پر متن زر کار دو شالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خانم:- (نواب کو دو شالہ دکھا کے) دیکھئے یہ دو شالہ کل بکنے کو آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار کہتا ہے،

پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیا ہے، وہ نہیں دیتا۔ میری نگاہ میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک
مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک
دو سالہ نواڈرہ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا، جی چاہتی تھیں کہ خانم نے جھوک کے کہا۔

خانم:- ٹھہر لو، تو ہمارے بچ میں نہ بولنا۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے، ایک فرمائش
ہماری بھی سہی۔

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم:- ادنیٰ نواب صاحب! سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجئے، سکوت
سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی، نہیں سہی، کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا
ارمان تو نکل جائے۔

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم:- لہذا! حضور جواب دیجئے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے! موئی بازاری کسی! مگر
آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھو کریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا
کو ذلیل نہ کیجئے۔

نواب:- (آب دیدہ ہو کر) خانم صاحب! اس دو سالے کی کوئی اصل نہیں ہے، مگر تم کو شاید
میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا؟ اور ہاں امراؤ جان بھی تو اس
دن وہیں تھیں۔

خانم:- مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں خیر تو ہے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے اشارہ کیا، وہ چپ رہیں، ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے
لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب:- اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کریں۔

خانم:- آپ کے دشمن اس قابل نہ رہے ہوں! اور میں ایسی چھوڑی نہیں جو روز فرمائش کیا
کروں۔ فرمائش کریں یا نہ کریں، بسم اللہ کریں! بھلایں بوزھی آڑھی، میری فرمائش
کیا اور میں کیا!

یہ کہہ کر خانم نے ایک آہ سرد بھری "ہائے تقدیر! اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے

رئیں ایک ذرا سے جھپٹنے کے لئے ہم سے منہ چھپاتے ہیں۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب:- خانم صاحب! آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں، اب میں اس لائق نہیں رہا جو کسی
کی فرمائش پوری کروں۔

اس کے بعد نواب نے اپنی تنہائی کا مختصر حال کہا۔

خانم:- خیر میاں! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں، پھر

رنڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا؟ حضور کو نہیں معلوم کہ پیسوا نہیں چار پیسے کی میت

ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورد۔۔۔۔۔ ہم لوگ

مروت کریں تو کھائیں کیا؟ یوں آئے، آپ کا گھر ہے، میں منہ نہیں کرتی، مگر آپ کو

اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہئے۔

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب:- واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھالیا۔

بسم اللہ:- اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

نواب:- (کسی قدر ترش ہو کر) میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ:- اے واہ! تم تو باطل خفا ہو گئے، جالتے کہاں ہو، ٹھہرو۔

نواب:- نہیں بسم اللہ جان! اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بے کار ہے۔ جب خدا ہمارے دن

پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور اب کیا دن پھریں گے!

بسم اللہ:- میں تو نہ جانے دوں گی۔

نواب:- تو کیا اپنی ماں سے جو سناں کھلاؤ گی؟

بسم اللہ:- (مجھ سے) ہاں سچ تو ہے، بہن امراؤ! آج یہ بڑی بی بی کو ہوا کیا تھا۔ برسوں ہو گئے میرے

کمرے میں آج تک جھاکی تک نہیں۔ آج آپ بھی تو قیامت پرا کر گئیں۔ بھئی

اماں جان چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں، میں نواب سے رسم ترک نہیں کر سکتی۔

آج نہیں ہے ان کے پاس نہ سہی، ایسی بھی کیا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا۔ آخر یہی

نواب ہیں جن کی بدولت ہزاروں روپے اماں جان نے پائے۔ آج اگر زمانہ ان سے پھر

گیا تو کیا ہم بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں، گھر سے نکال دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ملاں زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراء میں سچ کہتی ہوں نواب کا ہاتھ پکڑ کے کسی طرف کو نکل باؤں گی۔ لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی، ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔

بسم اللہ۔۔۔ اچھا نواب! تم کہاں رہتے ہو؟

نواب۔۔۔ کہاں بتاؤں؟

بسم اللہ۔۔۔ آخر کہیں تو؟

نواب۔۔۔ تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ اندر میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا

نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت شرمندہ ہوں۔

میں۔۔۔ یہ وہی مخدوم بخش ہے نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا جس کو آپ نے

موقوف کر دیا تھا؟

نواب۔۔۔ ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا۔۔۔

استنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اس کے بعد نواب صاحب، بسم اللہ

کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں

کردوں گی، اور اسی لئے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی، مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ نہ

کہہ سکی۔ نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے۔ غنم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت

اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں جو غنم نے آج کی

ہیں، وہ سب اس فمائش کی تمہید ہیں جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے، مگر مجھے بہت ہی

تشویش تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو۔

مرثام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشعل سے

ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی۔ اس سے معلوم

ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں، ابھی

تک نہیں آئے۔ دو گھنٹے تک انتظار کیا، نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش، آخر مایوس ہو کر گھر

چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے

مکان پر نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ملاہ وہی بڑھیا جو ایک دن غنم کے پاس آئی تھی، روتی بیٹھتی آئی۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا، بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتا نہ ملا۔

اس واقعے کے چوتھے پانچویں روز چھبن صاحب کے ہاتھ کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی

گئی، بیٹنے والے کو علی رضا بیگ کو تو ال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے

لڑکے نے بیٹنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا، خود امام بخش پکڑ بلایا گیا۔ پہلے امام بخش

صاف مکر گیا کہ میں اس انگوٹھی کو نہیں جانتا، آخر مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش۔۔۔ حضور! میں لب دریا لوہے کے پل کے پاس تھ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے

جاتے ہیں، ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے، ایک شریف

زادے، کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہو گی، گورے گورے سے تھے، بہت خوبصورت

نوجوان تھے، سرشام پکے پل پر نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دیے،

مجھ سے لنگی لے کے باندھی، خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کئے۔ پھر

میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے، کپڑے

بہن بہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا کہ کسی

طرف تھرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب

آئے ہیں، اب آتے ہیں، پہر رات گے رتک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے یقین ہو گیا کہ ذوب

گئے۔ اب میں نے دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں

گا۔ کھپا کھپا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے انھا کے

گھر پر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے۔ اس میں

خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس

انگوٹھی کو بھی نہ بیچتا، مگر میرا لڑکا شہداء ہو گیا ہے، وہ چرا کے لے آیا۔

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کو تولی سے ساتھ لے کر، وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے

منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانچے کی خبر کی۔ کپڑے

اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ۔!! آخر نواب چھبن صاحب ڈوب گئے نہ؟ میں تو سچ کہوں اماں جان کی گردن پر ان کا

خون ہوا۔

میں۔۔۔ افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی تھی، اسی لئے اس دن ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں گی، مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔

بسم اللہ۔۔۔ ان کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو! نہ ان کو جائیداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔

میں۔۔۔ خدا جانے اماں کا کیا حال ہوا ہو گا۔

بسم اللہ۔۔۔ سنا ہے بے چاری دیوانی ہو گئی ہیں۔

میں۔۔۔ جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمیں کا لڑکا تھا۔ ایک تو بے چاری رائد بیڑہ، دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹ پڑی، سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہو گیا۔

رسوا۔۔۔ تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجئے۔

میں۔۔۔ پوچھئے۔

رسوا۔۔۔ نواب صاحب تیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

میں۔۔۔ کیا معلوم، یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔۔۔ اس لئے کہ مجھے میری مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتایا تھا کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

(7)

کچھ ان کو امتحان دفا سے غرض نہ تھی

اک زار و ناتواں کے ستارے سے کام تھا

امراؤ۔۔۔ مرزا رسوا صاحب! آپ کو کسی سے کبھی عشق بھی ہوا ہے؟

رسوا۔۔۔ جی نہیں، خدا نہ کرے! آپ کو تو سینکڑوں سے عشق ہوا ہو گا، آپ اپنا حال کہئے۔ ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم حشاک ہیں، مگر آپ کہتی نہیں۔

امراؤ۔۔۔ یوں تو میرا رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے۔ جب کسی کو دام میں لایا جاتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی

سانسیں بھرتی، بات بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا، کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا، سنکھیا کھا لینا، یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو،

ہمارے فریب میں آتی جاتا ہے۔ مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی کا بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان

فرشتہ ان کے جال سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق تھے، اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں، سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا چہرہ بھی تھا۔ ایسے دیسے

مولوی نہ تھے، عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر

کرتی ہوں، سن شریف سترے کچھ کم ہی ہو گا۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سر منڈا ہوا، اس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا

تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔ ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں، اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے، بالکل صحیح صحیح

ہے۔ آپ کے دوست۔۔۔ میر صاحب قبلہ مرحوم، جن کو دلبر جان سے تعلق تھا، خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا،

مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ۔ شہر کی وضع دار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

رسوا۔۔۔ جی ہاں، کہئے، میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔

امراؤ۔۔۔ وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو، بسم اللہ جان خانم سے لڑکے کچھ دنوں کے لئے اس مکان میں جا رہی تھیں جو ہزارے کے بچھوڑے تھے۔

میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔

امراؤ۔۔۔ خیر، مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لئے اور اس غرض سے بھی کہ ہاں بیٹیوں میں ملاپ کیا

دوں، میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ
تکے سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی
صاحب قبلہ سامنے دور مہذب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے بسی کی
صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زمین کی تسبیح پر چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ
رہے ہیں۔ میں جو کئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے برابر بٹھالیا۔ میں میر صاحب اور
مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا
”تمنا دیکھو گی؟“

میں:- (حیران ہو کر) کیسا تمنا؟
بسم اللہ:- دیکھو!

یہ کہہ کر مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت
تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں
اور وہ تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمین میں گڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی
صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے
دوسرا حکم پہنچا، اور فوراً تیسرا نادری حکم ”چڑھ جاؤ، کہتی ہوں۔“

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے، عبائے شریف کو تختوں کے چوکے
پر چھوڑا، نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے۔ پھر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ذرا چپ بے
جہیں ہو کے کہا ”ہوں!“

مولوی صاحب پانچے چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔
اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور۔
بسم اللہ:- اور۔

مولوی صاحب اوپر چڑھے، پھر حکم کا انتظار کیا۔ پھر وہی ”اور“۔ اسی طرح درخت کی پھٹنگ
کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاید اس قدر ہمتی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان
بچ کر تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے ”اور“ نکلنے ہی کو تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی، میر صاحب
نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا ”اڑ آؤ“۔ مولوی صاحب چڑھنے کو چڑھ گئے
تھے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور اب گرے، مگر بخیر و

عنایت اتر آئے۔ بے چارے پسینہ پسینہ ہو گئے، دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو
سنجھال کے، نعلین پہن کے، تخت کے قریب آئے، عبائے مبارک زیب دوش کیا، چپکے بیٹھ گئے،
تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چھوٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے، اس
سے بہت پریشان تھے۔

رسوا:- بھئی واللہ! بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی۔
امراؤ:- دل لگی کا ذکر کیا، وہ بیدرد چپکی بیٹھی تھی، تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر
صاحب دونوں دم بخود بیٹھے تھے۔ ایک عجیب عالم عبرت طاری تھا۔
رہے گا کیوں کوئی طرز ستم باقی زمانے میں
مرا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا:- یہ جملہ عمر بھر بننے کے لئے کافی ہے، تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری
آنکھوں کے سامنے بسم اللہ، مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت، میر صاحب، تم،
صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویر کھینچ گئی۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی
نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بیشک بسم اللہ قیامت کی رنڈی
تھی۔ ستر برس کا بڑھا اور اس پر یہ حکم ”درخت پر چڑھ جاؤ“ اور وہ بھی چڑھ گئے۔
میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔

امراؤ:- واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔

رسوا:- اللہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟

امراؤ:- ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں۔ لے سیتے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا۔

میں:- بسم اللہ! یہ تجھ کو کیا ہوا تھا؟

بسم اللہ:- کیا؟

میں:- ستر برس کا بڑھا، اور جو درخت پر بے گر پڑتا تو مسافت خون ہوتا!

بسم اللہ:- ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موقع نے بوبک سے چلی ہوئی تھی۔ کل میری دھنوں

کو اس زور سے پنخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوئی۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی۔ اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا۔ ذرا اس کے

ٹھانٹھ سن لیجئے۔ اٹلس کی گھنگریا، کلدانی کی کرتی، جالی کی اوڑھنی، چاندی کی چوڑیاں، طوق گھونگھرو، سونے کی بالیاں جلیبیاں امرتیاں کھانے کو۔ جب مولیٰ تھی تو مولیٰ ذرا سی تھی، دوتین برس میں کھا کھا کے خوب مولیٰ ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر، اجنبی آدمی پر دفعتاً جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرز کا ہاتھ پکڑ لے تو پھر دالے نہ چھوئے۔

جس دن مولیٰ صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں، اس دن ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوجھا، دھنوکو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے چپکے آئی اور اچک کے مولیٰ صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولیٰ صاحب نے جو مزے دیکھا بے چارے گھبرا گئے، زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہوگی۔ مولیٰ صاحب پر کھو کھیا نے لگی۔ مولیٰ صاحب نے لافھی دکھائی، وہ ڈر کے مارے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو چمکار دوپٹے کا آنچل اوڑھادیا اور مولیٰ صاحب کو خوب دل کھول کے کوسا، گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا، دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا۔۔۔ سزا مناسب تھی۔

امراؤ۔۔۔ مناسبت میں تو کوئی شک نہیں، مولیٰ صاحب کو کھینکے کا لنگور بنا دیا۔

رسوا۔۔۔ واقعی مولیٰ صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سنگ سلی کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا اور مولیٰ صاحب نے بسم اللہ جان کی چیمیتی بندریا کو اول تو جھٹک دیا، پھر

یہ بے ادبی کہ اسے لافھی دکھائی، عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔

ایک دن، رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گارہی ہیں، میں طنزورہ چھیڑ رہی ہوں، خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں مولیٰ صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ۔۔۔ (دیکھتے ہی) یہ آٹھ دن سے آپ کہاں تھے؟

مولیٰ صاحب۔۔۔ کیا کہوں، مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا، مگر تمہارا دیدار دیکھنا تھا، اس لئے جانہ ہو گیا۔

بسم اللہ۔۔۔ تو یہ کہئے وصال ہو گیا تھا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو چھو کا دیا۔

مولیٰ صاحب۔۔۔ جی ہاں، آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ۔۔۔ واللہ اچھا ہوتا!

مولیٰ صاحب۔۔۔ میرے مرنے سے آپ کا کیا نفع ہوتا ہے؟

بسم اللہ۔۔۔ جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے۔ گاتے، ناچتے، لوگوں کو رجاتے، آپ کا نام روشن کرتے۔

اسی طرح چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی

اسی کافر کی ادا یاد آئی

مولیٰ صاحب پر دھوکے کی حالت طاری تھی۔ آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے نپک رہے تھے۔

اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب جوان، گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی، میانہ قد، کسرتی بدن، جلدانی کا انگر کھا پھنسا پھنسا پہنے ہوئے، کھلے پانچوں کا پاجامہ، ٹھلی جوتا نہایت عمدہ، جالی پر کی چکن کارومال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا، واہ صاحب! اس دن کے گئے آج آپ آئے۔ لے بس اب ٹہلے۔ میں ایسی آشنائی نہیں رکھتی۔ اور وہ لال طاقی گرنٹ کے طاقے کہاں ہیں؟ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔

وہ صاحب۔۔۔ (لجابت کے لہجے میں) نہیں سرکار! یہ بات نہیں، اس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی۔ واللہ کی طبیعت علیل تھی، میں ان کی تیمارداری میں تھا۔

بسم اللہ۔۔۔ جی ہاں، آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں، مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ آج کل بہن کی چھو کر پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی دربار داری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں

ملی ہیں، اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والدہ کی طبیعت علیل تھی۔

اس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولیٰ صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ان کی اور ان کی آنکھیں

چار ہوئیں۔ مولیٰ صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔ دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول، کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ

پکارتی کی پکارتی رہی، انہوں نے جواب نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پیلے تو چپ سی ہو گئی، مگر پھر ایک مرتبہ تیوری چڑھا کر آپ ہی

آپ کہنے لگی ”پھر باشد!“ اتنا کہہ کے گاتے میں مصروف ہو گئی۔ اس دن کے بعد میں نے ان کو

رسوا:- تو پاک محبت نہ ہوگی۔

امراؤ:- اب یہ ان کا ایمان جانے، میں تو یہی سمجھتی تھی۔

خانم کی نوہ جیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی، مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی سورت تھی، رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کے بھر دیئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔

بھرے بھرے بازو، گول کلاسیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دل فریبی، وہ بھولا پن کہ جو ایک نظر دیکھے، ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔

جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی، معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ تھا، مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی۔ اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجئے، خود

اپنے ہاتھ عمر بھر خراب رہی، حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی اپنے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خداداد تھا، مگر اس حسن و جمال پر ضبط یہ تھا

کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو وہ خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہو گا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا ہو۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزار بار روپے کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔

خورشید نے بھی انہیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے، خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم

سب نے صلاح دی ”دیکھو خورشید! ایسا نہ کرو۔ مردے بے مروت ہوتے ہیں۔ تمہارے ان کے صرف آشنائی ہے، آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا، بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی، پھٹاؤ گی۔ آخر تمہارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے، لگے غمزے

کرنے۔ یا تو آنکھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ دو دو پہروں نہیں آتے۔ خورشید جان دیئے

دیتی ہے۔ روتی ہے، بیٹھتی ہے، کھانا نہیں کھاتی، عجیب حال ہے، خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی، یہاں تک کہ آنا جانا، کھانا پینا، آدمیوں کی سچاواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جو رو ہوتی تو میاں بیوی میں خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے

پیتا، بشرطیکہ قدردان ہوتا۔ بسم اللہ، خورشید کے تلوؤں کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر وہ تمکنت، وہ غرور، وہ غمزہ، وہ تکسور کہ خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ اور آشنائوں

کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا، مولوی صاحب برابر آیا کئے۔

رسوا:- جی ہاں! اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضع دار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سن کے کہ میں بھی یہاں ہوں، نہیں چلے آئے۔ ان سے بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوچ سے نے کر کشتم کشتیم نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھوڑا نہ تھا کہ برامنتی۔

گوہر مرزا آتے ہی میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں پیٹھ گیا اور جھپ سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

گوہر مرزا:- آج تو خوب گارہی ہو۔ جی چاہتا ہے۔

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی، پھر اپنا کان زور سے پکڑا،

جھک کے بیٹھے ہٹا۔ (یہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ ڈر گئے) بسم اللہ اس حرکت پر بے حاشا ہنس پڑی، خلیفہ جی مسکرانے لگے، میں نے منہ پر رومال رکھ لیا، مگر مولوی صاحب بہت ہی پیچھے بہ جی

ہوئے۔ بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں کہ بسم اللہ نے کہا ”بیٹھو“۔ بے چارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی

کیا ہی شریر تھی۔ مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں، تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا نے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے

میں رکھا، اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو، جھلے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے بسی پر مجھی کو رحم آیا، میں نے بھانڈا پھوڑ

دیا۔ اس پر بسم اللہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا ”لے اب جھلا پن کر چکے، چلو۔“

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا کا مجھ سے رسم ہے، بسم اللہ کا کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ہی خوش ہوئے، باچھیں کھل گئیں۔

رسوا:- مولوی صاحب کو تو پاک محبت تھی نا؟

امراؤ:- پاک محبت تھی۔

رسوا:- پھر ان کو جلنا نہ چاہئے تھا۔

امراؤ:- واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔

سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی ماں کی دولت پر بڑا گھنڈ تھا۔ واقعی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہستی ہی نہ سمجھتی تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی پر آواز بالکل ہی نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول مجرے بہت آتے تھے، آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں، لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھادہ صورت کا مشتاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے، مگر جب آکے دیکھا نہ تھو تھائے بیٹھی ہیں۔ ان پر عشق سوار تھا، ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف رہ گئے۔ ادھر ترائی دیکھئے کہ پیارے صاحب کے والد پر عتاب شہی نازل ہوا۔ گھر کی ضبطی ہو گئی، جاگیر چھین لی گئی، بے چارے محتاج ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھالو۔ پیارے صاحب نے بہ پاس خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ کیا، خورشید کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی بھگی عورت تھی۔ سینکڑوں روپے پھسلا پھسلا کے لوگ کھائے۔ فقیر فقیر سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی، اس میں سیاہ تل بھر دایئے، کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چینی ڈھا نگ دی۔ شال بان کا ایک پارچہ گلے میں باندھ نازے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے آج نہ کھونہ کل صبح کو کھونہ مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی، کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے پرسوں آکے ڈس جائے گا۔ خورشید نے کانوں سے پتے بالیاں اتار کے حوالے کیں۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں تو بہو بیٹیوں میں بھی کم ہوتی ہیں، رنڈیوں کا ذکر کیا۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا، جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اول تو چپکی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی، رفتہ رفتہ سرخ بمبھو کا ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھی، مانجھے کے جوڑے کو پرزے پرزے کر ڈالا۔ اب رقت شروع ہوئی۔ دو دن تک رویا کی۔ تمام دنیا نے سمجھایا، کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کیا، لیکن

خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بہ خود رو بہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر چشم چمٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی، مگر کسی سے دل نہ لگا، اور نہ کسی کا دل ان سے، اس لئے کہ بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساوان کا مہینہ ہے، سہ پہر کا وقت ہے، پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ کچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر جمع کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمعے کا دن ہے، لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ اور میں میلے جانے کے لئے بن ٹمن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے جو ابھی رنگ ریز رنگ کے دے گیا ہے، چنے جاتے ہیں، بالوں میں کنگھیاں ہو رہی ہیں، چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، بھاری زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکلے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی ابھی بیچوان لگا کے بیچے ہوئی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں ”آج میری طبیعت سست ہے، میں نہیں جانے کی۔“ ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جو بن ہے۔ گوری رنگت ململ کے دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرنٹ کا پاجامہ بڑے بڑے پانچوں کا سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پھنسی پھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے۔ ہاتھ گھڑی ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل، کانوں میں سونے کی انتیاں، ہاتھوں میں کڑے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے میں قد آدم آئینہ لگا ہے، اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی! اگر میری صورت، ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلا نہیں لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اس صورت کا کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ چہرہ اداس اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس پری پیلر کی صورت دیکھنے سے دل پسا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے شاعر کا کوئی شعر درد آمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ، کتابی چہرہ، سوتواں ناک، بڑی بڑی

آنکھیں، سیاہ پتلی، چہرہ بدن، بوٹا سا قد، کار چوبی تولوں جوڑا، کاہی کریب کا دوپٹا بنت نکی ہوئی، زرد گرنٹ کا پاجامہ، بیش قیمت زیور سر سے پاؤں تک، گبنے میں لدی ہوئی، اس پر طرہ پھولوں کا گہنا۔ این میں چوتھی کی دہن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس پر بات بات میں شوخی و شرارت۔ میبلے میں پہنچ کر کسی کا منہ چڑھا دیا، کسی سے آنکھ لڑائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو منہ پھیر لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگھار کر کے میاںوں میں سوار ہوئے، میبلے پہنچے۔

میبلے میں وہ بھیڑ میں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو مرنے ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں۔ خوانچے والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساتھیں، غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے، سب کچھ تھا۔ مجھے اور تو کسی چیز سے کچھ کام نہیں، لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے، خصوصاً میبلے تماشوں میں۔ خوش، ناخوش، منطس، تو نگر، بے وقوف، عقل مند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل، یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگر کے اور ادوی صدری، نلکہ دار نوپی، چست گھٹنے اور نکلی چڑھویں جوتے پر اتارتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں مندلی رنگا ہوا دوپٹا سر سے آڑا باندھے ہوئے، رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میبلے دیکھنے، مگر بہت ہی مکدر، ہیں بہ جبین، کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑ کے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب برداشت نہ سوچے تھے انہیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ ”اماں کھانا پکاتی ہوں گی، اماں کا جی ماندہ ہے، اماں سوری ہوں گی، اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو، نہیں تو اماں حکیم کے ہاں چلی جادیں گی۔“ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں، کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں نخسی سی نتھنی ہے۔ ادنیٰ چوٹی گندھی ہوئی، لال شال باف کا موباف پڑا ہے۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہوئے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتارے۔ کہنے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجے دوسرے صاحب۔ ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی مٹھیاں چل رہی ہیں ”اماں پان تو کھاؤ“ کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا۔ معلوم ہوا کہ آپ بڑے تو نگر ہیں۔ پیسے دو پیسے کی آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقے والے کو آواز بھی دے دی۔

”بھئی ساتی ادھر آنا، حقہ سلگا ہوا ہے؟“ ایک اور یار ان کے آمو جوہ ہوئے۔ معمولی گالی گلوچ

کے بعد ملاقات، سلام، بندگی، مزاج پر سی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ ”ابے پان تو کھلوا“ لطف یہ کہ آپ مسلمان، یار ہندو۔ جب تنبولی نے پان دیئے بھٹ سے بڑھ کے لے لئے۔ ”ارے یار بھول گئے“ اب یہ کھسیانے ہوئے۔ ٹینٹ سے ایک پیسہ نکالا۔ ”لو بھئی ہمیں بھی دو پان دینا، الاٹھی بھی چھوڑ دینا، چوننا زیادہ نہ ہو۔“ دوست سے ”اچھا تو چلم تو پلواؤ گے؟“ چلم حقے سے اتارتے ہی تھے کہ ساتی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا، وہیں جا کے ٹھہرے۔ ادھر ادھر درختوں میں پھرتے رہے۔ سر شام سے دو گھڑی رات گئے تک میبلے کی سیر کی، پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میاںوں میں آکر سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میاںہ خالی ہے، ان کا کوئی پتا نہیں۔ پہلے تو شبہ ہوا کہ یہیں کہیں درختوں میں ہوں گی۔ دور دور تک تلاش کے لئے آدمی دوڑائے۔ گوہر مرزا نے جا کے سارا میبلہ چھان مارا، کہیں پتا نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا۔ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں کہ مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میبلے بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے، جاتا تو کیونکر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں ہی بے جا سا گمان تھا، ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ بھی نہ رہا، وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انہوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ اگلی محبت کے خیال سے، کچھ خانم کی مردت سے نہیں معلوم کس طرح چلے آئے تھے۔

حصہ دوم

(1)

تیدی الفت، صیاد رہا ہوتے ہیں

خورشید کے گم ہونے کے ذریعہ مہینے کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں جیسی تھی۔ سانولا رنگ، چھریا بدن، ایک دو شاہ کمرے سے لپیٹے اور ایک کمرے سے باندھے میرے کمرے میں درانا چلے آئے اور آنے کے ساتھ ہی سامنے قالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے، یا ابھی انیلے ہیں، رنڈیوں کے یہاں جانے کا کم اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی، وہ کمرے میں آئیں۔ ان کے آتے ہی وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا، علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں، جن میں کچھ میں نے سنیں اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم کے پاس گئیں۔ وہاں سے آنے پر پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا۔ ”آپ کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دینی ہوگی۔“ ان صاحب نے کمرے سے بینڈ روپوں کی نکالی، بوا حسینی نے گود پھیلائی، انہوں نے چھن سے روپے پھینک دیئے۔

بوا حسینی:- یہ کتنے ہیں؟

وہ صاحب:- نہیں معلوم، گن لیجئے۔

بوا حسینی:- اے ہے مجھے تو نگوڑا گنا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب:- میں جانتا ہوں، پچھتر روپے ہوں گے۔ شاید ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔

بوا حسینی:- میاں پچھتر کسے کہتے ہیں؟

وہ صاحب۔۔۔ تین بیٹی اور پندرہ بچیں کم سو۔

بوا حسینی۔۔۔ بچیں کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟

وہ صاحب۔۔۔ پندرہ دن کی۔ کل وہ مجھے پندرہ دن کی دسے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو خرچے آپ کو پہنچ جائیں گے۔

یہ ”نخرچے“ سن کر مجھے بہت اکیلا برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ کوئی ایسے ہی دے ہیں، مگر مجبور، رنڈی کا پیشہ، دوسرے پر اسے بس میں، کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا، اس لئے کہ بڑے بڑے رئیس سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لئے ہمدرد نہیں کرتی تھیں یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہو گی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے بیچے آکے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا ”لو اب میں جاتا ہوں، کل شب کو پھر آؤں گا“۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں ایک سونے کی، یا قوت کا نگینہ، ایک فیروزے کی، ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا یہ تم اپنے پاس رکھنا، خانم کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں لیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا، اشرفیاں اور انگوٹھیاں چور خانے میں چھپا کے رکھ دیں۔

دوسرے دن شب کو وہی صاحب پھر آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آکر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دیئے۔ استاد جی اور سارنگے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی نے کمرے میں جو دو شالہ بندھا ہوا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر کی۔ پھر منہ پھوڑ کے مانگا، مگر دار خالی گیا، انہوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب۔۔۔ استاد جی! روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کیٹے موجود ہے، یہ دو شالہ میں نہیں دے سکتا، ایک دوست کی نشانی ہے۔

استاد جی اپنا سامنہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم موقوف ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی پچتر گن دیئے گئے۔ پانچ روپے بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیئے۔ وہ رخصت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے، میں نے

پوچھا ”آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی؟“

وہ۔۔۔ دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔

میں۔۔۔ اور پھر آئے دو مہینے کے بعد؟

وہ۔۔۔ میں باہر چلا گیا تھا، اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے رنڈی پنہ کی لگاؤ شروع کی۔

میں۔۔۔ تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟

وہ۔۔۔ نہیں، پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔

میں۔۔۔ اور تمہارا مکان کہاں ہے؟

وہ۔۔۔ مکان تو فرخ آباد میں ہے، مگر یہاں بہت کام رہتا ہے، بلکہ رہتا نہیں ہوں، کچھ

دنوں کے لئے باہر چلا جاتا ہوں، پھر چلا آتا ہوں۔

میں۔۔۔ اور یہ دو شالہ کس کی نشانی ہے؟

وہ۔۔۔ کسی کی نہیں۔

میں۔۔۔ واہ! میں سمجھ گئی، یہ تمہاری آشنا کی نشانی ہے۔

وہ۔۔۔ نہیں، تمہارے سر کی قسم! میری کوئی آشنا آشنا نہیں ہے، بس تمہی ہو جو کچھ ہو۔

میں۔۔۔ تو پھر مجھے دے دو۔

وہ۔۔۔ میں نہیں دے سکتا۔

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انہوں نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمرہ کی ہریں لگیں ہوئی تھیں اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھالیا۔ صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی، مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دے دیتے ہیں، مگر یہ دو شالہ زیادہ سے زیادہ پانسو کا ہو گا، اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو دو شالہ پسند نہ تھا جو میں زیادہ اصرار کرتی۔ اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے، اور کبھی آدھی رات کو، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے چلے جاتے تھے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کئی مرتبہ دستک باسی کی آوازیں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہو گا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جزاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس

خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کمال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ اور نفرت ہونے کی کیا وجہ! اول تو وہ کچھ بد صورت بھی نہ تھے۔ دوسرے لینا لینا عجیب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے، میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمد و رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لئے سویرے سے کھسک جاتے تھے۔ اور جو صاحب جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی جیلے سے نال دیتی تھی۔

خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس انداز میں فیض علی کئی مرتبہ دو دو تین تین دن تک غائب رہے اور پھر چلے آئے۔ واقعی فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی، جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہو تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دل جوئی اور ظاہر داری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بے چارہ میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپے پیسے کی کوئی پروا نہ تھی۔ ایسا دل چلا آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔

رسول: جی ہاں کیوں نہیں، مال مفت دل بے رحم، بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا ہے؟

امراؤ: مال مفت کیوں!

رسول: نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور روز آپ کو اتار اتار کے لادیا کرتا تھا؟

امراؤ: ہمیں کیا معلوم تھا۔

شب کے آنے والوں میں ایک پنابل جوہری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے انہیں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپے کا نقد سلوک اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے یا دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا، اب جو آئے تو کچھ اداس اداس۔ معمولی باتوں کا

جواب دیتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا۔

پنابل: کیا تم نے سنا نہ ہو گا؟

میں: کیا؟

پنابل: ہم تو تباہ ہو گئے، گھر میں چوری ہو گئی پشتینیوں کا سب اثاثہ اٹھ گیا۔

میں: (چونک کے) ہائیں! چوری ہو گئی؟ کتنے کمال گیا؟

پنابل: سب اٹھ گیا، رہا کیا، دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔

میں دل میں ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ پنابل تو کروڑ پتی مشہور تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے، مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ یہ ظاہر منہ بنا کے بہت انوس کیا۔

پنابل: جی ہاں، آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے ہاں چوری ہوئی، لالہ

گوہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہوئے ہیں۔

مرزا علی رضا بیگ بے چارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے، کسی

سے کچھ پتا نہیں ملا۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں۔

پنابل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا۔ میں

بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو خلائق کا انبوه ہے۔

ایک: آخر گرفتار ہوئے نا؟

دوسرا: وہ مرزا کیا کرنا! کو تو ال ہو تو ایسا ہو۔

تیسرا: کیوں بھئی کچھ مال کا پتا بھی لگا؟

چوتھا: بہت کچھ برآمد ہوا، مگر ابھی بہت سبب باقی ہے۔

پانچواں: میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے؟

ہمسایہ: وہ کیا آتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارو ساتھ ہے،

گرد خلائق کا انبوه ہے۔ میاں فیضو منہ پر دوپٹا ڈالے ہوئے ہیں، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ

دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمولی فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔

کر دو گی؟ میں نے کہا ”میں تو نہ جاؤں گی۔“ بوا حسینی نے کہا ”نہیں، جانا ہو گا۔ غاص تمہاری فرمائش ہے، اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے اور روپیہ بھی لے لیا ہے۔“ میں نے کہا ”بوا! میں نہیں جانے کی، روپیہ پھیر دو۔“

بوا حسینی:- بھلا تم جانتی ہو، خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟

میں:- چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو! اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔

بوا حسینی:- آہ! اب تم بڑی روپے والی ہو گئی ہو۔ لاؤ پھیر دو۔

میں:- کتنا روپیہ ہے؟

بوا حسینی:- سو روپے۔

میں:- سو روپے لوگی یا کسی کی جان؟

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی:- بڑی کھری ہو تو دے دو۔

میں:- شام کو دے دوں گی۔

بوا حسینی:- وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ شام تک کے لئے کیوں مانیں گے؟

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھی تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ مجرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقچے میں اس وقت کچھ نہ ہوں گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی اشرفیاں تھیں، زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں:- جاؤ گھنٹے بھر میں لے جانا۔

بوا حسینی:- گھنٹے بھر میں کیا مؤکل دے جائیں گے؟

میں:- ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ بھئی، اس وقت دن نہ کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔

بوا حسینی:- آخر کچھ کہہ تو لو کی کیا ہوا؟

میں:- مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔

بوا حسینی:- (ماٹھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا) ہاں سچ تو ہے، پنڈا پھیکا ہے، مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں

جانا ہو گا، جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا۔ روپے کیوں پھیرے

جائیں۔

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آگئی۔ دل نے کہہ دیا جی، جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے، تو ان لوگوں کے ساتھ رہنا بیکار ہے۔

رسوا:- کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا۔

امراؤ:- کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا:- اس لئے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراؤ:- یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔

رسوا:- کھلی ہوئی بات تو ہے، مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔

امراؤ:- وہ باریکی کیا ہے، خدا کے لئے جلدی کیجئے؟

رسوا:- فیض علی کے ساتھ نکل چلنا وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کہ کیوں کر نکل چلوں۔

امراؤ:- نہیں یہ بات نہ تھی۔ میں دودلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت پھیرنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا۔ بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سلا رادہ تھا۔ جب رات کو فیض علی آئے تو ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے پکارا رادہ ہو گیا۔

رسوا:- جی نہیں، پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا اسی لئے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بری معلوم ہوئی، ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہو گا۔

امراؤ:- میں نے مانا کہ ایسا ہی ہو گا اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا؟ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے ”امراؤ نہ جہ کہا مان“ جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیتا ہے کہ نہ جہ مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا:- یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔

امراؤ:- اچھا! یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا:- جی نہیں، یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا اچھا کام تھا۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں، اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کیا ہو۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدتر تھا۔ بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔ عیش باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے، مگر اس کی شکل و شمائل، رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپے کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ افسوس! اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے دام میں نہ آتیں۔

امراؤ:- میں پڑھوں گی، کسی کتاب کا نام لیجئے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے، اتر دکن اونچی اونچی رنڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک بیبا جان کا مکان ہے، دوسری طرف حسین باندھی رہتی ہے۔ پچھواڑے میں حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرضیکہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے رہتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی، مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازے پر رہتا تھا، کیونکہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پھر بہر رات چلے جاتے تھے دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے لکڑی کے مشورے ہوا کئے۔ اتنے میں مکانے انگڑائی لی، معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے کمرے میں بلایا، ایک روپیہ جیب سے نکال کے دیا، کہا ”جاؤ کوئی کی دکان سے اس کی امرتیاں لے آؤ، اور اے لویہ روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا، ہم جاگ رہے ہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔“

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا، لو اب چلو۔ میں انھی، دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گھڑی میں باندھ رکھے تھے، زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ گھڑی بغل میں دبائی۔ اکبری دروازے کی طرف کاراستہ لیا۔ نخاس میں بیل گاڑی پہلے سے ہی کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چل نکلے۔ ہنڈولنے کے ناکے سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سانس گھوڑا لئے ہوئے ملا، وہ بھی بہل کے ساتھ ہو لیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرا میں دوپہر تک قیام ہوا بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دل ابر کی بے نمک پھسکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خریدا۔ میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے بہن کے آئی تھی، اتار کے گھڑی میں باندھے۔ رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنؤ سے آئی تھی، رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ کی، لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شاموں شام پہنچ گئے۔ رات سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کے لئے بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی۔ نصیب نام تھا، گہنے پاتے سے درست تھی، کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصباتیوں کا ایسا تھا۔ میری اس کی دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیب:- آپ کہاں سے آئی ہیں؟

میں:- فیض آباد سے۔

نصیب:- فیض آباد میں تو میری بہن پیارن رہتی ہے، آپ ضرور جانتی ہوں گی۔

میں:- (آخر پہچان گئی ناکہ میں بھی رنڈی ہوں) میں کیا جانوں۔

نصیب:- فیض آباد میں کون ایسی پتیا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔

میں:- بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں، اسی لئے میں بھی

اکثر وہیں رہتی ہوں۔

نصیب:- آخر پیدائش تو تمہاری فیض آباد کی ہے نا؟

میں:- (یہ تو بالکل سچ کہتی ہے، اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی، مگر بچنے سے باہر

نصیب:- رہا۔
تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتیں؟

میں:- کسی کو نہیں۔

نصیب:- یہاں کیوں کر آنا ہوا؟

میں:- ان کے ساتھ ہوں۔

نصیب:- اور جاؤ گی کہاں؟

میں:- آناؤ۔

نصیب:- لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو؟

میں:- ہاں۔

نصیب:- پھر سیدھا راستہ چھوڑ کے ادھر بھڑ میں کہاں آئی ہو، نہ پتہ گنج ہو کے اناؤ چلی گئی ہو تیں؟

میں:- رائے بریلی میں ان کو کچھ کام تھا۔

نصیب:- میں نے اس لئے کہا کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ پلیہ کی بھڑ میں سینکڑوں کو لوٹ لیا۔ آناؤ کا راستہ ادھر ہی سے ہو

کے ہے۔ تم تین آدمی ہو جس میں دو مرد ایک عورت ذات۔ تمہارے گلے میں گھنا بھی

ہے۔ بھلا تمہاری کیا حقیقت ہے، وہاں تو برائیاں لٹ جاتی ہیں۔

میں:- تن پہ تقدیر۔

نصیب:- بڑی دل کی کڑی ہو۔

میں:- پھر کیا کروں!

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضروری نہیں اور نہ ہی مجھے یاد ہیں۔

ہاں میں نے پوچھا۔

میں:- تم کہاں جاؤ گی؟

نصیب:- ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔

میں:- میں نہیں سمجھی؟

نصیب:- اے لو گدائی نہیں جانتیں، کیسی پتیریا ہو؟

میں:- بہن میں کیا جانوں، گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔

نصیب:- ہمارے دشمن بھیک مانگیں۔ اور سچ پوچھو تو کہوں، پتیریا کی ذات بھیک منگنی ہے، اس

میں ڈیرے دار ہو، یا نہ ہو۔

میں:- یہ تو سچ ہے، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ گدائی کسے کہتے ہیں۔

نصیب:- سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ امیروں،

رہیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔ جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے، ہمیں

دیتا ہے۔ کہیں مجرا ہوتا ہے، کہیں نہیں ہوتا۔

میں:- اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں؟

نصیب:- ہاں، اب سمجھیں۔

میں:- یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہوئی ہو؟

نصیب:- یہاں سے تھوڑی دور پر شیو دھیان سنگھ ایک راجا کی گڑھی ہے، انہی کے پاس گئی

تھی۔ راجا صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے، ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔

کئی دن ٹھہری رہی، آخر دم گھبرا یا۔ یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے سمریہا، وہ

گاؤں بالکل پتیریوں کا ہے۔ وہاں میری خالہ رہتی ہیں۔ کل ان کے پاس جاؤں گی۔

میں:- پھر کہاں جاؤ گی؟

نصیب:- وہیں ٹھہری رہوں گی۔ جب راجا صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤں گی۔ اور بہت

سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں:- کیا راجا صاحب کو ناچ مجرے سے بہت شوق ہے؟

نصیب:- بہت شوق تھا۔

میں:- کیوں اب کیا ہوا؟

نصیب:- جب سے ایک پتیریا لکھنؤ سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔

میں:- اس پتیریا کا کیا نام ہے؟

نصیب:- نام تو مجھ کو یاد نہیں، صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے۔ ذرا پھرے مہرے کی

اچھی ہے۔

میں:- گلتی تو خوب ہو گی؟

نصیب۔۔ خاک! گانا دانا کچھ نہیں آتا، ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجا صاحب اسی پر لٹو ہیں۔

میں۔۔ کتنے دنوں سے وہ پتیا آئی ہے؟

نصیب۔۔ کوئی چہ نہیں ہوئے ہوں گے۔

رات کو میں نے فیض علی سے راستے کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا ”خاطر جمع رکھو ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔“

دوسرے دن منہ اندھیرے ہم لال گنج کی سرائے سے روانہ ہوئے۔ نصیب کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیب بانیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی دور چل کے سمر بہا ملا۔ نصیب نے دور سے ہم کو وہ گاڑوں دکھایا۔ سوک کے کنارے کھیت تھے۔ ان میں کچھ گنواریاں پانی دے رہی تھیں، کچھ کھیت زرا رہی تھیں۔ ایک پرانی چل رہی تھی۔ اس میں ایک مسنڈی عورت دھوتی باندھے بیل ہٹا رہی تھی۔ ایک پرانے رہی تھی۔ نصیب نے کہا یہ سب پتیاں ہیں۔ میں نے دل میں کہا وہ یہ پیشہ بھی کیا، پھر اس قدر محنت جو مردوں سے بمشکل ہو۔ آخر ان کو پتیا ہونا کیا ضرور تھا۔ مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ میں کندھے والیاں، وہی والیاں، گھونس آتی ہیں، ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیب یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس اور جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا تھہر، بڑے بڑے غار۔ سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں، دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی، کوئی پہر دن چڑھا ہو گا۔ اس سوک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلتے دکھائی نہ دیتا تھا، چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی، وہ یہ جادو جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا، پھر ندی کے پار جا کے معلوم ہوا۔ ہماری گاڑی اسی طرح چلی جاتی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا، سائیں گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے! تھوڑی دیر میں گنواروں نے آکر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے، بندوقیں کندھے پر تھیں، توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار۔۔ (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟

گاڑی بان۔۔ یہ سواری بریلی سے آئی ہے، آناؤ کا بھڑا کیا ہے۔

گنوار۔۔ روک گاڑی۔

گاڑی بان۔۔ گاڑی کیوں روکیں، خان صاحب کے ہاں کی زبانی سواری ہے۔

گنوار۔۔ کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟

گاڑی بان۔۔ مرد آگے بڑھ گئے ہیں، آتے ہوں گے۔

گنوار۔۔ اترو بی بی گاڑی سے؟

ایک۔۔ پردہ کھول کے کھینچ لو یار۔ سسری پتیا تو ہے، اس کا پردہ کیا۔

ایک گنوار آگے بڑھا، گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ تین آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ناپوں کی آواز آئی۔ جب گھوڑے قریب آئے، میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے، پیچھے اور دس پندرہ سواری ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری۔ اس میں دو سواری ادھر سے گر پڑے۔ پھر تلواریں میان سے نکلیں۔ سوار سر پر ہی آگئے تھے۔ ادھر سے بھی تلواریں کھینچ گئیں۔ دو ایک ہاتھ چلے ہو گئے۔ تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کے گرے اور ادھر سے ایک سوار گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔ ”اچھا کہاں جاؤ گے۔ دیکھو ندی کے اس پار کیا ہوتا ہے۔“

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اس کے پٹیاں کسی گئیں۔ وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سواری ہماری گاڑی کے ادھر ادھر ہیں۔ کچھ سوار آگے ہیں، کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی۔۔ (اپنے ساتھی سے) بھائی فضل علی کسی طرح لکھتو سے نکلنا ہی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی۔۔ یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے۔

فیض علی۔۔ ہاں یہ تو کہو گے۔

فضل علی۔۔ کہیں گے کیا، تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھائی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی۔۔ آپ سے کوئی پردہ ہے، دیکھئے۔

فضل علی۔۔ ڈیرے پر چل کے باہر دیکھیں گے۔

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ کنارہ بہت اونچا تھا، مجھ کو گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا

تھے۔ ایک پر دس ٹوٹ پڑے، بہت زخمی ہوئے۔ فضل علی اور فیض علی موقع پا کر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی گرفتار ہوئے۔ انہی گرفتاروں میں میں بھی تھی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا، جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کے رائے بریلی کی طرف روانہ ہوا۔ مردوں کی مشکلیں کسی گئیں، گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی چار پانچ کوس تھی۔ تھوڑی دور جا کے راجا صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجا صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجا۔ یہی بی لکھتو سے آئی ہیں؟

میں۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور! قصور وار ہوں، لیکن اگر غور کیجئے تو ایسا قصور بھی نہیں۔

عورت ذات، جعل فریب سے آگاہ نہیں۔ میں کیا جانتی تھی؟

راجا۔ اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ قصور آپ کا ثابت ہے۔ جو

ہاتھیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجئے۔

میں۔ جو حکم حاکم۔

راجا۔ لکھتو میں کہاں مکان ہے؟

میں۔ ٹکسال کے پاس۔

راجا۔ جہاں خانم کا مکان ہے وہیں؟

میں۔ حضور وہیں۔

راجا۔ (آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تخت کھیرے سے ایک بیل گاڑی لے لو۔ لکھتو کی

رندیاں ہیں، ہمارے دیس کی پتیریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات

کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔

میں۔ حضور کو خدا سلامت رکھے!

آدمی گئے، کھیرے سے گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی پر بٹھایا۔ اور لوگ اسی طرح مشکلیں کے

ہوئے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دیئے گئے، میں کوٹ میں بلائی گئی، ستر مکان رہنے

کو دیا گیا، دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا پوریاں کوریاں مٹھائیاں طرح طرح کے اچار

پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی پر تھا اس کے زخم گاڑی کی تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے۔ گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آچکا تھا۔ مجھے شرت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس بلغ تھا، اس میں چھوٹا دریا پڑی ہوئی تھیں، گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آکر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے دوڑ کے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے، فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی۔ اچھا دیکھا جائے گا، کھانا تو کھا لو۔

فضل علی۔ کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ہے، ایسے میں نکل چلو۔

فیض علی۔ اچھا، جب تک چھوٹا دریاں اکھاڑی جائیں، گھوڑوں پر زین کسے جائیں، ہم لوگ کھانا کھا لیں۔

میں گاڑی سے اتری۔ ایک آم کے درخت کے نیچے دری بچھادی گئی، سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں۔ تھئی کی تھئی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں، فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے، مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

یعنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا، چھوٹا دریاں اکھاڑ کے ٹٹوں پر لادی گئیں زین کسے گئے۔

آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آکر گھیر لیا۔ ادھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں، کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گراہہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے، راجا شیو دھیان سنگھ کے آدمی بہت

کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ روانہ کر دیئے گئے۔ مجھ کو رہائی کا حکم ہے، مگر ابھی راجا صاحب رخصت نہیں کریں گے۔ رہبر بھرون چڑھے راجا صاحب نے بلا بھیجا۔

راجا۔ اچھا ہم نے تم کو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بد معاش نکل گئے۔ اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ بیشک تمہارا کوئی قصور نہیں، مگر آئندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا، اگر تمہارا جی چاہے دو چار دن یہاں رہو۔ ہم نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔

میں۔ (نصیبین کی وہ بات یاد آئی کہ راجا صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی رنڈی ہے۔ ہو نہ ہو اسی نے میری تعریف کی ہوگی) حضور نے کس سے سنا؟

راجا۔ اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی وہ رنڈی کون؟ خورشید جاننا۔ خورشید دوڑ کے مجھ سے پٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگیں۔ آخر راجا صاحب کے غم سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مودب بیٹھ گئیں۔ سازندے طلب ہوئے۔

رہائی کی خبر سن کے میں نے ایک صبا حال غزل کہہ لی تھی۔ بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجا صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی محفوظ ہوئے۔ بے خودی کا عالم طاری تھا۔ غزل یہ ہے۔

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں
خوش نوا یاں چمن زاد رہا ہوتے ہیں
تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو
کوئی ہم اے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں
حسرت اے ذوق اسیری کہ خفا ہے صیاد
آج ہم بادل نشاد رہا ہوتے ہیں
فاخر نازک صیاد کو برداشت نہیں
بامٹ نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں
غم دنیا نہ سسی، اور ہزاروں غم ہیں

قید ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں
کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر
ہم تو اے لذت بیداد رہا ہوتے ہیں
اے ندا قید محبت سے رہائی معلوم
کب اسیر غم صیاد رہا ہوتے ہیں
مقطع سن کے راجا صاحب نے پوچھا۔ ”ادا کس کا تخلص ہے؟“
خورشید نے کہا ”خود انہی کی کہی ہوئی ہے۔“ راجا اور بھی خوش ہوئے۔

راجا۔

اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز رہانہ کرتے۔

میں۔

غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسی کا تو افسوس ہے، مگر اب تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجا صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے، خورشید کی مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید۔ دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب سے اور راجا صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجا صاحب نے کئی مرتبہ مجھے بلوایا، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے، مجھ کو زبردستی اٹھالائے۔ جب سے یہیں ہوں، ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے، سب طرح کا آرام ہے۔

میں۔

موسے گنواروں میں خوب تمہارا جی لگتا ہے۔

خورشید۔

یہ بات توجہ ہے۔ مگر تم میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جانا میرے بالکل خلاف ہے۔ وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجا صاحب سے سابقہ ہے، اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ میرا وطن ہے۔

میں۔

یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں۔

تو تمہارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟

خورشید۔

مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں، بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں۔

میں یہاں تو نہ رہوں گی، مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید۔

لکھنؤ جاؤ گی؟

میں:۔ نہیں۔

خورشید:۔ پھر کہاں؟

میں:۔ جہاں خدا لے جائے۔

خورشید:۔ ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں:۔ ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی، خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا

تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجا صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں:۔ حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے؟

راجا:۔ ہاں! تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟

میں:۔ جی ہاں! اب لونڈی کو رخصت کیجئے، پھر حاضر ہوں گی۔

راجا:۔ یہ لکھنوی فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤ گی؟

میں:۔ کانپور۔

راجا:۔ لکھنؤ نہ جاؤ گی؟

میں:۔ حضور! لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ غنم سے کیسی شرمندگی ہو گی، ساتھ والیاں کیا

کیا نہیں گی۔

ادل تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا، دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجا صاحب

سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہو گی، کیونکہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید غنم کوئی آفت

برپا کرتیں۔

راجا صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجا:۔ تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی؟

میں:۔ لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے۔ جہاں رہوں گی، کوئی نہ کوئی

قدر دان نکل ہی آئے گا۔ غنم کی حمید میں رہنا اب مجھے منظور نہیں۔ اگر وہاں رہنا ہوتا

تو نکل کیوں آتی؟

میں نے راجا صاحب کو یقین دلایا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجا نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں، ایک دو شلہ دیا، ایک رومال،

ایک رحم مع تین بیل غرضیکہ انہوں نے مجھے ڈیرہ وار پتیا بنا دیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی

میرے ساتھ گئے۔ آناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سلارو بھٹیاریے کے مکان میں ٹھہری۔ راجا صاحب

کے آدمیوں کو رخصت کیا، صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سرشام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں

”میاں مسافر! ادھر ادھر۔ مکان جھاڑا ہوا ہے، تھ پانی کو آرام، کھانے پینے کو آرام، گھوڑے ٹٹو کے

لئے نیم کاسیہ.....“

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سرا کے پھانک ہی سے اس کی نگاہ

مجھ پر پڑی، میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا۔ پہلے میرا

حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا ”ان کو آپ کے اناؤ آنے کی خبر

مل گئی ہے، آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آجاویں گے۔“

یہ سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تخت

کھیرے کے دانے کے بعد میں سمجھتی تھی کہ اب گلو غلامی ہو گئی ہے۔ اناؤ میں فیض علی کے ملنے کا

مان گمان تک نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا لو پھر آفت کا سامنا ہوا، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ فیض علی میری

جان نہ چھوڑیں گے۔ رات کوئی ڈیڑھ پہر رات گئے فیض علی جان پر نازل ہو گئے۔ معمولی بات

چیت کے بعد اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ

گاڑی بان کو رخصت کر دو۔ سائیس گاڑی ہٹائے گا۔ میں خود گھوڑے کو دیکھ لوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ

گاڑی سلارو بھٹیاریے کے پاس چھوڑ دو، راتوں رات گنگا کے اس پار اتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی۔

فیض علی کے بس میں تھی۔ جو انہوں نے کہا پار و ناپار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلارو کو بلایا،

کنارے لے جا کے دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا،

سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زمین کا چلتا رات کا وقت، میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا۔

آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناولٹ کی، اس پار اترے، فیض علی نے

کہا ”اب کوئی خوف نہیں ہے۔“ صبح ہوتے ہوئے کانپور پہنچ گئے۔ فیض علی نے مجھ کو لافھی محال کی

سرائے میں اتارا، خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے کہا۔ ”یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں

ہے، مکان ہم نے ٹھہرایا ہے، وہاں چلی چلو۔“ ڈولی کرایہ پر کی۔ تھوڑی دیر میں ڈولی ایک بختہ علی

شان مکان کے دروازے پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر جا کے کیا دیکھتی

ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ نکلے ہوئے چلے گئے۔ میں ایک گلی میں ہو رہی۔ تھوڑی دور جا کے ایک پتلی سی گلی ملی۔ اسی گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے، تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میں درانا اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہمد باندھے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے ”کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟“

میں:- میں مسافر ہوں، خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاؤ کی نظر اور دل فریب تقریر نے بادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام میں آگئے۔

مولوی:- (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں:- جی کہیں سے آنا ہوا، مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی:- (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں:- جی نہیں، بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی:- لا حول ولا قوۃ!

میں:- ادنیٰ مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی:- جی ہاں، تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لئے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے۔

میں:- یہ کیا... غاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔ مسجد میں ہمارا

کچھ کام نہیں، یہ خوب کئی! آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی:- میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں:- میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی:- لا حول ولا قوۃ۔

میں:- لا حول ولا قوۃ؟ یہ آپ ہر دفعہ لا حول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پڑا

ہے؟

مولوی:- شیطان آدمی کا دشمن ہے، اس سے ہر دممت ڈرنا چاہئے۔

ہوں کہ ایک دالان میں دو کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک پٹنائی بچھی ہوئی ہے، اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے، جسے دیکھتے ہی پینے سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا ”اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ میں نے کہا ”بہتر، مگر ذرا جلدی آنا۔“ فیض علی بازار کو گئے، میں اسی مکان میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنے، فیض علی بازار کو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ ایک گھڑی، دو گھڑی، پہر، دو پہر، کہاں تک کہوں۔ دو پہر گزری، شام ہونے کو آئی۔ انڈ میں سرشام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان، نیند کا غار، صبح سے منہ پر چلو پانی تک نہیں پڑا، مگر ایک نہیں کھایا، بھوک کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا، اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات ہو گئی۔ یا خدا اب کیا کروں۔ منہ کھول دیا، اٹھ بیٹھی۔ استنا بڑا ڈھنڈا مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ بہت بات، خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کو ٹھہری سے کوئی نکلا، وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے سے دھم دھم کی آواز آئی، زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اتر چلا آتا ہے۔ دو پہر رات ہو گئی۔ اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی، اب چاند بھی چھپ گیا، بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا۔ آخر میں دو شالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کالے نہیں کنتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کس مصیبت میں جان پڑی، لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمر یاد آتا تھا، ادھر ایک آواز دی ادھر آدمی مستعد۔ حقہ، پان، کھانا، پانی، جو کچھ ہوا دھر منہ کیا ادھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دو پہر ہو گئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی تیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔ میرا ہواؤ تو کھلا ہوا نہ تھا۔ مگر پھر بھی سینکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے اکثر گلی کوچوں سے واقف۔ یہاں کی بھی سرادیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس غالی مکان میں بیٹھی رہتی۔ جھپ سے کنڈی کھول گئی میں نکل کھڑی ہوئی۔ گھر سے دس بیس قدم گئی ہوں گی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے، گھوڑے پر سوار، دس پندرہ برق انداز ساتھ، ان کے حلقے میں میاں فیض علی منڈیاں کسی ہوئیں، سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی، وہیں ٹھٹک گئی، ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ خیریت یہ

میں:- خدا سے ڈرنا چاہیے، موائے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا آپ آدمی ہیں؟

مولوی:- (ذرا بگڑے کے) جی ہاں اور کون ہیں؟

میں:- مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی

نہیں گھبراتا؟

مولوی:- پھر کیا کریں، ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں:- اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برسی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔

تہا منشی کہ نیم دیوانگی است

مولوی:- اجی وہ کچھ سہی۔ جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہئے؟

میں:- مطلب تو کتاب کے دیکھنے سے حل ہو گا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی:- چہ خوش!

میں:- چر باشد۔

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی، مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

رسوا:- یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟

امراؤ:- اے ہے اس کا حال نہ پوچھو۔ بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ

ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا:- جی ہاں، جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلائی ہے،

چہیت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ:- بس یہی سمجھ لیجئے۔

رسوا:- اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا

تھا؟

امراؤ:- کیا کہوں، کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے، صورت بھی کچھ بری نہ تھی۔ سانولی

رنگت تھی، چہرے پر رونق پن تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی، مگر کچھ

بے تنکے پن کی حد سے بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہمد بہت ادنیٰ بندھی

ہوئی تھی۔ سر پر پھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوحدی ڈھانکے ہوئے

تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا، پھر بند ہو جاتا تھا۔ سنبھلے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی نکلے دار داڑھی کچھ عجب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہر سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں، اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا:- کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟

امراؤ:- جی نہیں، جگالی کر رہے تھے۔

رسوا:- اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور

عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

امراؤ:- اور سنئے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا، وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے

تھے۔

رسوا:- یہ تو عین تمیز داری ہے، اس لئے کہ عند التقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہو گا۔

امراؤ:- کچھ اور بھی عرض کروں؟

رسوا:- بس اب معاف کیجئے، یہاں تو صبح ہو گئی۔

امراؤ:- القلم میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

مولوی:- (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے، جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے) ”اس کی کیا

ضرورت تھی۔“

میں:- (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی، اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے، کسی سے کچھ

کھانے کو مانگا دیجئے؟

مولوی:- (اب جھپٹے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا۔ (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک۔

سمجھتے تو پتھر کے ہو جائے) اسی لئے تو کہنا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں

ممکن نہیں ہے؟

میں:- امکان بالقوہ یا بالفعل، بالذات یا بالغیر؟

مولوی:- بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہو گا، آپ بھی کھا لیجئے گا۔

میں:- بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں، اور یہاں ضرورت نے اکل

میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے، لہذا بازار سے کچھ لاد لیجئے۔

مولوی:- اب ذرا صبر کیجئے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔

میں:- اب صبر کرنا تکلیف والا بھلا ہے۔ اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی:- اس وقت تو فی نفس الامر میں کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہو گا۔ اور بفرض والتسلیم لو کان حالا اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہو گا، میری شرکت اس میں یعنی چہ؟ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مضمون ہے۔ تا قریاق از عراق آوردہ شود.....

مولوی:- آہا، آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں:- مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی:- واقعی ایسا ہی ہے، مگر.....

میں:- (بات کاٹ کر) مگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی:- اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں:- لند ذرا جلدی لاسیئے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربالا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی:- (فوراً ساڑھے چودہ گھنٹے پیسے، کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کر سامنے رکھ دیئے) سنے صاحب! چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسے کا سالن ہے، دھیلا بھانج (روپے کا خوردہ) میں گیا، آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی مگر بھوک بری بلا ہے، جلدی جلدی نوالے اٹھانا شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں:- میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی:- تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے؟

میں:- حلوائی کی دکان تو ہو گی؟

مولوی:- حلوائی کی دکان یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں:- تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے۔ موئے

کتوں کا راتب۔

مولوی:- ایسا تو نہ کیجئے۔ آدمی کھاتے ہیں۔

میں:- آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا نیلا شوربا!

مولوی:- نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو دہی لادوں؟

میں:- جی نہیں رہنے دیجئے، معاف کیجئے۔

مولوی:- پیسے کا خیال نہ کیجئے، میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد سے باہر چلے گئے۔ اور ایک آب خورے میں خدا جانے کب کا سزا ہوا کھانا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

بہر طور میں نے وہ چار روٹیاں اگل نکل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی یوں ہلکی چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیسے کوڑیاں بھی دیں پڑے رہنے دیئے۔

میں ہاتھ دھوئے کوالنھی تھی، مولوی صاحب سمجھے مسجد سے دفنان ہوتی ہے۔

مولوی:- اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

میں:- میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجئے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آئی تھی، مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔

کان پور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انہی کی معرفت ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ نوازی پلنگ، دری، چاندنی، چھت، پردے، تانبے کے برتن اور سب ضروریات کا سامان خرید لیا۔

ایک ماما کھانے پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کاج کو، دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے، ماما سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج، پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ

کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ غلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگے کانپور کے ذرا سمجھ دار تھے، بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا رہنے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آدمی آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کم بخت ہو گا جو کسی جلسے میں جاننا نہ ہوتا ہو۔ مجھے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سارے پیہ کمایا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا راہ رویہ بول چال مجھے پسند نہ تھی، بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا، مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر غانم کی نوجوانی بن کے رہنا پڑے گا، کیوں کہ اس پیشے میں رہ کر لکھنؤ میں غانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں غانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہیں ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچا دینا تھا۔ ناچ مجھے کا دھچکریوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی غانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے دایوں میں تھا، مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے، عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدر دانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی، جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا ہو گا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے۔ ایک صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹے ہی انہوں نے پوچھا ”آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟“ میں نے کہا ”نہیں۔ کون حضرت شارق؟“ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے، فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب۔ میں تو سنتا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟

میں۔ جی ہاں غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں۔

میں۔ لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے، جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر

ہی کیا ہے، ان کے نام بر آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہو گا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں۔ (جیس بہ جبیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ! تخلص شرق سے غرب اور شمال سے

دہ صاحب۔ جنوب تک زبان زد ظائق ہیں۔ ہاں اک آپ نہیں جانتیں، نہ جانیں!

میں۔ حضور معاف کیجئے گا، میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلق ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں،

آپ کو ایسا ہی کہنا چاہئے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو، نام سے واقف ہوں۔

دہ صاحب۔ میرا شتم علی صاحب شارق۔

میں۔ اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں۔ (استنا کہہ کے اب میں فکر کرنے میں لگی۔ یا

الہی یہ کون میرا شتم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

دہ صاحب۔ جی ہاں، مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں۔ بجا ارشاد ہوا، یعنی میرا صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب۔ انہی صاحبوں کے ہمسر ہیں۔

میں۔ بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

دہ صاحب۔ کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے، خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا

مرثیہ پڑھا تھا، تمام شہر میں شہرہ ہے۔

میں۔ مطلع تو آپ کو یاد ہو گا؟

دہ صاحب۔ مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا، وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان پر

ہے۔ قلم تو زردیا ہے۔

میں۔ ذرا ارشاد کیجئے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

دہ صاحب۔ نکلی غلاف نور سے تفسیر جو مری۔

میں۔ بھان اللہ! اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجئے، واقعی

کیا کلام ہے!

دہ صاحب۔ (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں، آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہو گا۔ وہی تو میں کہتا

تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق، حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں۔

تجربہ ہے۔ اب میں سمجھایہ مذاق تھا۔

میرے جی میں آیا کہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جنیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے۔ مرزا دبیر (مرحوم) کا کلام ہے، مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا۔ واقعی آپ نے بڑی عقل مندی کی، ورنہ بے چارے کی روزی میں غل آتا۔ میرا ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبوں کا یہی شمار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا کے لئے گئے، حیدر آباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی، مگر سمجھنے والے سمجھ گئے۔ لکھتو سے خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ منس کے چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھتو کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تھکن کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی، خود لکھتو میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آکر رہے، پلئے اچھے فارغ لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ۔

امراؤ۔ جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھتو فردشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔ اس زمانے میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھتو سے کوئی باہر جاتا تھا، بلکہ ہر شہر کے کالمین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے، اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اجڑ کے لکھتو آباد ہوا تھا۔

رسوا۔ فی زمانہ یہی حال دکن کا بھی ہے۔ لکھتو اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں، مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھتو والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ۔ جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی موج نکالیں۔

رسوا۔ کیا خوب بات کہی ہے! واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے، مگر لہجہ نہیں آتا۔

(2)

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں یوں بھی ہوتا ہے کہ پھرے ہوئے مل جاتے ہیں

پھرے ہوئے مل جاتے ہیں، اور پھر کب کے پھرے ہوئے؟ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے۔ کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گاٹی ہوئی غزلیں لوگ گالتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کے دن ہیں، کوئی دو بجے کا وقت ہو گا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ مانا بدرجی خانے میں خرائے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹنیاں ٹٹک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی پھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے بیچے کسی نے آکر پوچھا "لکھتو سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرہ یہی ہے؟" درگاہنے (جس کی دکان بیچے تھی) نے جواب دیا، "ہاں یہی ہے۔" پھر دریافت کیا، "دروازہ کہاں ہے؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا کالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ، تن زیب کا کرتا، نین سکہ کا پانچواں بڑے بڑے پانچوں کا پیسے، ہاتھوں میں چاندی کے مونے مونے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں، ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا سالز کا کوئی

دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی۔ لکھتو سے تمہی آئی ہو؟

جی ہاں۔

اتنا کہہ کے میں پلنگ سے بیچے آئی، پان دان آگے کھسکایا، آدمی کو سٹے کے لئے آواز دی۔

بڑی بی۔ ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ جلسہ ہو گا۔ تمہارا بھرا کیا ہے؟

جی ہاں۔

اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے بلانے کا یہ بھی

ایک سبب ہے کہ بیگم صاحب خود بھی لکھتو کی رہنے والی ہیں۔

اور آپ بھی تو لکھتو کی ہیں؟

میں۔ اگرچہ مجھے کاہ دستور نہیں ہے، مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی دشن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سینکڑوں جگہ مجھے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے، خدا خدا کر کے استنادن کنا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آمو جو ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی، سازندوں کو بلوار کھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتا بتا دیا، میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹے بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تازہ کھجور اور طرح طرح کے خوب صورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کئی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کمنگروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے ارد گرد دب جھلی گئی تھی۔ باغ میں ہر چار طرف پکے برے بنے ہوئے تھے ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتھروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا، کیسے ترد تازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کو ٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گلے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سنتے والا نہ تھا، آپ ہی آپ گایا کی، پھر چپ ہو رہی، بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاند نکل آیا، چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد دلاستی پھولوں کے ناندے نہایت خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے، اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوتر تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنکھ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں پانی نہر سے آ کے گرنا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔

بڑی بی۔ تم نے کیوں کر جانا؟
میں۔ کہیں بارت چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی۔ ہاں، میں بھی وہیں گی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ، ابھی بہت کام پڑا ہے۔
میں۔ مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں، پچاس روپے لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انہوں نے قدر کر کے بلایا ہے، تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔
جلہ کب ہے؟

بڑی بی۔ آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کچھڑی کا تولو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔
میں۔ (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب کہئے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی۔ مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے یہ لڑکا سر شام آئے گا، اسی کے ساتھ چلی آؤ۔
مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔
میں۔ اور سازندے؟

بڑی بی۔ سازندے، خدمت گار، ان کی منائی نہیں ہے، کوئی اور نہ ہو۔
میں۔ جی نہیں، یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی، خاطر جمع رکھئے۔

اتنے میں خدمت گار نے حہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حہ پہنچے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھہ چونا لگا کے، ڈسیوں کا چورا ڈیبا میں پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹکی اس کی اور الاٹھی کے دانے پان دان کے ڈھکنوں پر کھل کے گھوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی۔ ہائے پٹنا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔
میں۔ آپ کھائیے تو، میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی سمجھ گئیں۔ پان لے کے کھایا، بہت ہی خوش ہوئیں۔ ”ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری!“ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئیں رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں۔ ”ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔“

واقعی عجیب عالم تھا۔ تمام کا سہانا دھت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں کی مہک۔ ایسی فضا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جبوترے پر سفید چاندنی کافر ش تھا، مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کراچی سے لے کر اس جبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ جبوترے پر دو سبز مرد نگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنوئیں لئے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیئے۔ مازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ، وہیں کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہو گا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحبہ برآمد ہوئیں، بیگم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو قریب بلایا، خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت فور سے دیکھ رہی تھی۔

حیرانی نگاہ تماش کرے کوئی
صورت وہ رد برد ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور دہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ پری میرے سامنے گاؤں تکتے سے لگی تھیں۔ مائیک لکھی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا تھا، کھینچی ہوئی بھوئیں، بڑی بڑی آنکھیں، گال جیسے گلاب کی پتیاں، لمبھوئی ناک، چھوٹا سا دہانا، پٹے پٹے نازک ہونٹ۔ نقتے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سینے کا ابھرا پن کس قدر خوش نما تھا۔ سینکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھجک ملتی تھی۔ مگر کہاں خورشید کہاں وہ! خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھر کم پن کہاں! دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک چہرہ ابدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہرہ ادا سی برستی تھی، جب دیکھو بردگن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بہ خود ہنسنے دیتی ہیں مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انہی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشد سب کرتے ہیں مگر عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ ایسوں کی خوشد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔

لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹا کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کچلی کا شلو کا پھنسا پھنسا، سرخ گرٹ کا پانچا، کانوں میں صرف یاقت کے آویڑے، ناک میں میرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی سمرنیں، بازوؤں پر تو رتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی، اور زیور کی مناسبت، یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے، وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجئے گا، ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی ہٹکھا بھل رہی ہے، دو سامنے کھڑی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا، دوسری کے پاس غاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انہوں نے سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا۔

بیگم۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں۔ (ہاتھ باندھ کے) امراؤ۔

بیگم۔ "غاص لکھتو میں مکان ہے۔"

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا، خصوصاً اس موقع پر، اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھتو میں مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فہم ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل لگنے لگتا ہے، راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے)

میں۔ جی ہاں، پرورش تو لکھتو میں پائی ہے۔

جواب دینے کو تودے دیا، مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی دھت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا، اس لئے کہ فوراً ہی بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

بیگم۔ تو کیا پیدائش لکھتو کی نہیں ہے؟

اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ آخر اس بات کو نال کے۔

میں۔ حضور کا دولت خانہ لکھتو میں ہے؟

بیگم۔ کبھی لکھتو میں تھا، اب تو کانپور ہی وطن ہو گیا۔

میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم: کیوں؟

میں: (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا۔ کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں، بیکار سمجھ کر فراموش ہو گئی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ لکھتے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم: چلو اچھا ہے، تو ہمارے پاس بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں: آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جالنے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی قدردانی، دوسرے یہ باغ، یہ فناء ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو؟ خصوصاً مجھ جیسی خفاتی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب و ہوا کسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم: اے ہے! تمہیں یہ جھگڑا بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات، یہ بات خدا کی ذات، شہرے کو سوں دور۔ چار پیسوں کا سودا منگواؤ تو آدمی صبح کا گیا (شام کو آتا ہے۔ چھائیں پھوئیں، شیطان کے کان بہرے، کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں، یہاں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

میں: حضور اپنی اپنی طبیعت! مجھے تو بہت ہی پسند ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم: جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے۔ اور سب باتوں کو جانے دو، جب سے نواب کلکتے گئے ہیں، راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیئے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس مرد نوکر ہیں۔ عورتوں کی گنتی نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں تو دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں، اگر نواب جی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں: قصور معاف ہو، آپ کا مزاج وہی ہے۔ ایسے ایسے دوسرا دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائے گا تو قدر و عافیت کھلے گی۔ وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیمار یاں، خدا پناہ میں رکھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کر آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا، خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کد کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی دیر تک لے رہی اور پیار کیا کی، پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں: یوں تو شاید نہ بھی آئی، مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم: (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں: ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دو بھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گلے کی بہت تعریف کی۔ اسی اشتیاق خاصہ والی نے آکے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھا لو۔

میں: بہت خوب!

بیگم: مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں، میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا تم یہیں ٹھہرو۔ ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں: واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم: تو کیا کھانا۔ یہیں منگوا لیا جائے؟

میں: جی نہیں! اچھا کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم: (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلو دیا گیا؟

مہری: (ہاتھ باندھ کے) حضور! دلو دیا گیا۔

بیگم: اچھا نہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا محرامعاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جا دیں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کو ٹھہ کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا ”مجھ کو تم سے بہت باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہ ہو گی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا۔ یہیں کھانا“

میں: مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم: اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھالیں، اس کے بعد تمہارا کھانا سنیں گے۔

میں: پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم۔ ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے۔ اس پر گانا۔

میں۔ بہت خوب!

اب ہم کو لمبی کے زینے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بہت وسیع کو لمبی تھی اور اس طرح سلیطے سے سچی ہوئی تھی کہ شاہی کو لمبیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کو لمبی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا، اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجایا ہوا تھا۔ ہر کمرے کا فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان چٹنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک جتشی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔

دسترخوان پر کئی قسم کے پلاؤ، بریانی، مزعفر، متغین، سفیدہ، شیر برنج، باقرغانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مرے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرض کہ ہمہ قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھتے سے لطف کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلایا۔

بہن دانی اور تسلا آیا، ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے۔ پھر اسی وجہ سے پر جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں صرف بیگم صاحب ہی نہ تھیں۔ جتشی نویس، مصاحبین، مظانیاں، پیش خدمتیں، مہربیاں، ملائیں، سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحب نے حکم دیا کہ طبلے کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب، جو طبلہ بجانے میں مشق تھی، طبلہ بجانے لگی، خود بیگم صاحب ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بج کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ، جس میں بہت سارے درخت تھے، جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، غیب و حشت ناک سماں دکھایا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کو لمبی کے ایک گوشے سے چھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز میسا تک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن پل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ مگر تلاب میں پانی کرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں

چونک کر ایک ہا تک بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چیزیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھوک جاتے تھے یا کبھی کوئی ٹھٹھلی تلاب میں اچھل پڑتی تھی۔ پنڈک اپنا بے تکاراگ گارہے تھے۔ بھیگ کر آس دے رہے تھے۔ سوائے اس وجہ سے کہ، جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں، اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جمونکوں سے کنول بھگ گئے تھے۔ صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی، ان کے بھی شیشے سبز۔ تاروں کا عکس تلاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ دلت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بمیا تک مردوں نے دلوں پر لہنا اثر کیا تھا۔ سب مہبوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھنا جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی، اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا، بیشک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس امن میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز آئی، اس نے اور بھی دلوں کو دہلا دیا، اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم صاحب نے گاؤں تکتے سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مزے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو ہیں سمجھ چکی تھی کہ وہ یہی ہیں، مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے دہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈانٹے باندھے، نیکی تلواریں ہاتھ میں، دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار، پاسی سب اسی طرف کوچے۔ کوئی نہتا، کسی کے ہاتھ ہیں لافھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے ہی سے فرار ہو گئے، چار پانچ آدمی وجہ سے یک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے عورتوں کو بچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا، سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں، خدا جانے کیا مقرر دل تھا کہ ٹٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ! دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے۔ وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی

ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو، ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر

لیجئے دو۔ (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو۔ جس ارادے سے آئے ہیں تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز۔ وہی میں پوچھتا ہوں، جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ دارے کا بیر ہے؟ ہاں جس ارادے سے

آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا ہو بیٹیوں کی آبرو لو گے؟ اگر یہ مقصد ہو..... (سرفراز

پوری بات بھی کرنے نہ پایا تھا کہ کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا)

کوئی ڈاکو۔ ناساحب! کسی کی ہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے ہو بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں

کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے؟

سرفراز۔ (خوش ہو کے) تو پھر یہی میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو، ہم ابھی تمہیں کمروں کی کھیاں

منگائے دیتے ہیں، اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک

بیگم۔ یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ، جو جی چاہے اٹھالے جاؤ۔ رہا عورتوں کا

زیور وہ بھی ہم اتردائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا

کے حکم سے لاکھوں روپیہ بینک گھر میں جمع ہے۔ علاقے سے جو آتا ہے اس کا ذکر

نہیں۔

ڈاکو۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز۔ سپاہی کے پوت دغا نہیں کرتے، خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آوازیں نے پہچانی تھی، آگے بڑھا۔

ڈاکو۔ واہ کیا کہنا! مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا تو کھیاں؟

استنا کہنا تھا کہ میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے پہچان تو لیا، بولنے کا قصد کیا، مگر دل

میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا

”بھائی! تم یہاں کہاں؟“

میں۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے۔ یہیں ہوں۔

فضل علی۔ یہاں کس کے پاس؟

میں۔ رشتہ تو شہر میں ہوں لیکن یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں، ان

سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں۔ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بے چاری غش میں پڑی ہیں۔

میری طرح تو ہیں نہیں، بیچاری پردہ نشیں ہیں؟

فضل علی۔ پردہ نشیں ہیں؟

میں۔ جوانی میں راند ہو نہیں، جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی۔ (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسے کی چیز لینا میرے نزدیک تو حرام ہے اور نہ

میں اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو۔ یہ کیا، پھر آئے کیوں تھے؟

فضل علی۔ جس ارادے سے آئے، تمہیں معلوم ہے، مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے۔ مجھ سے نہیں

ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں، یا جس سرکار سے ان لوگوں

کا تو سل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا!

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا، مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے، کوئی

دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے ”فاقوں

مرتے ہیں، کریں تو کیا کریں۔ ایک موقع ملا بھی تو اسے خان صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ

کہاں سے پالیں۔“

جب فضل علی اپنے گرد سے نکل کے الگ گھرے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور

شخص سیاہ فام سایہ کھتا ہوا نکلا۔

وہ شخص۔ کھان صاحب، میں بھی تھرے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا ساتھی ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ علیحدہ لے جا

کے باتیں کیں۔ وہ اشرافی اور روپے جو بیگم صاحب نے انعام دیئے تھے، چپکے سے اسے دے دیئے۔

فضل علی۔ (سرفراز خان سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز۔ میں ان لوگوں کو بھی راضی کئے دیتا ہوں۔ مگر یہاں سے چلو۔ غور میں پریشان ہو رہی ہیں۔ ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کریں گے۔ ڈاکو ہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت پیٹھ گئے تھے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی، ان کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا "منجھل کے پیٹھے، خدا کے صدقے سے وہ آفت نل گئی۔ خاطر جمع رکھئے۔" اور عورتوں کو بھی پانی پھونک کر اٹھایا۔ سب اللہ کے فیضیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خان کو بلا بھیجا۔

سرفراز۔ سرکار کچھ دے دیجئے، بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت نلتی۔

بیگم۔ کسی نہ کسی وقت کی محبت کام آتی جاتی ہے۔

میں نے اس بات کا جواب نہ دیا، اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت گھبراہٹ میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔ جی نہیں۔ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا۔ پانچ سونے اور پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انہیں ملا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم۔ کیوں امراؤ جان! باغ میں رہنے کا مزاد کھائے؟

میں۔ حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے، سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھو دیا گیا۔ نیند کسے آتی۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہوتے سب سو گئے۔ میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آئے۔ مجھے جگایا، میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار۔ آپ تو خوب یہاں آئیں، رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار۔ اچھا تو اب چلئے۔ لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر پتا لگایا نا!

میں۔ اچھا چلتی ہوں، سواری لائے ہو؟

خدمت گار۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو رد کا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جاییے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے، بیگم صاحبہ خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

عورتیں۔ بھلا اب کیا آؤں گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں، بوا حسینی اور میاں گوہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے پٹ گئیں، رونے لگیں، میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی۔ اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر دیا۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی، جواب کیا دیتی، جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ، انہوں نے نہ مانا۔ زیادہ غلٹ کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے، بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی، جو چلی آئی تھیں، وہ دن کانپور سے اسباب وغیرہ کے باندھنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرائے پر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لا دیا اور فضول سلمان نوکروں کو دیدیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان، وہی کمرہ، وہی آدمی۔

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل

زندہاں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

(3)

دیکھئے پہنچے کہاں تک سوزش دل کا اثر

صر صر دشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملک کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی اثناء میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرایوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب نکلنے چلے گئے، وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں باغی فوج نے مرزا برہیں قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا، میں بہ لحاظ قدامت اور اس درجہ بے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر شاہ کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے، ان کا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے، اس لئے اکثر دہلی رہنا پڑتا تھا۔ مجھے کے لئے بھی وقت بے وقت طلبی ہو جاتی تھی۔ اب چند روزہ حکومت کے زمانے میں برہیں قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسے میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برہیں قدر
گوہر نایاب ہے برہیں قدر
میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی، اس کا مطلع یہ ہے۔
دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

امرؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے۔ اور کوئی شریاد ہو تو پڑھو۔
امرؤ! گیارہ شر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم! سوا اس مطلع کے اور کوئی شریاد نہیں۔
وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا، نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچے پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں، وہ پرچہ میرے پان دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا، بول جول میں پان دان کیما، جو تیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

امرؤ! بھلا کچھ یاد ہے؟ بیگم صاحب کس دن قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امرؤ! دن تو یاد نہیں، ہزاری روزے، کے دوسرے یا تیسرے دن۔

امرؤ! ہاں تمہیں خوب یاد رہا، رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کون سی تھی؟

امرؤ! اخیر جاڑے تھے، نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

امرؤ! بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تو تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں؟

امرؤ! جی ہاں، بونڈی تک میں ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بڑول افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ ”لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔“ دوسرے صاحب فرماتے ہیں ”بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔“ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رد رہے ہیں کہ حق دقت پر نہیں ملا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر دھاوا کیا ہے، اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

امرؤ! سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

امرؤ! آپ نے تو سنا ہے، میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھتو کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھتو کا چوک معلوم ہوتا تھا۔ اچھا اس قصے سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا، اس کا حشر کیا ہوا؟

امرؤ! (ایک سرد آہ بھر کے) اے ہے یہ نہ پوچھئے۔

امرؤ! غدر میں سب لٹ گیا؟

امرؤ! غدر میں لٹ جاتا تو اتنا فوس نہ ہوتا۔

امرؤ! پھر کیا ہوا؟

امرؤ! سارا قصہ دہرانا پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے دلی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں، اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔ خانم کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے، امام بازے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جایا تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چار پائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان کے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انہوں نے

فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپیٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدار میں تمام دنیا کے گھر لے۔ اگر کہہ دیتیں کہ سٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی، مگر داہری بیوی! ایک جبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھنبا ہوا ہے۔ نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

بھلا کتنے کامال ہو گا؟

کوئی دس پندرہ ہزار کامال تھا۔

اور اب کیا ہوا؟

کیا ہوا؟ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک جبہ بھی غدار میں نہیں ملا، سب مال تمہارے پاس ہے۔

اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک خوش پوشاک بھی ہو۔

خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ ضرور اس کو ملتا ہے۔ اس مال کا تو ایک جبہ بھی نہیں رہا۔

اچھا تو پھر کیا ہوا؟

اب کیا بتاؤں، ایک مہربان۔۔۔۔۔

میں سمجھ گیا۔ یہ گوہر مرزا کی حرکت ہو گی؟

میں اپنے منہ سے نہیں کہتی، شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

بیشک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھئے وہ چین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا، نہ رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں۔

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی

رسوا۔

اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ۔

وہ کاہے کو تشریف لائیں گے۔ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا۔

جب بھی کچھ دے ہی آئی ہو گی؟

امراؤ۔

جی نہیں، میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا۔

تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے ہتھے لگا؟

امراؤ۔

مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہاتھوں کا میل ہے، فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں! کبھی تنگی بھوکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے! مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا۔

اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو سے اچھی، ہزار سے اچھی۔ واللہ! یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ۔

جی ہاں، مولانا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے۔

پھر مجھے کربلا بلا بھیجیں

میری منی عزیز ہو جائے

مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا، مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا، پھر نہ آؤں گی۔

(4)

سن چکے حال تباہی کا مری، اور سنو

اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور برہمن قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں آخری، پھر ترپولے کے پاس ایک کمرہ کرائے کو لے لیا، میراثی نوکر رکھ لئے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہے۔ آنسوؤں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے۔ اس پر ہر ہے۔ تمام شہر میں

میرے کانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے بیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں بھی یاد آجاتی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت، غدر، برہمن، قدر یہ سب سانچے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجہ ہتھکڑیا ہوا گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے فدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اگر ہو تو اب ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ اور عالم میں ہوں گے۔ میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی یہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی، مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لئے جاؤں، غام جیتی ہیں تو کیا ہو، ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہ وہی اگلی حکومت جتانیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا، وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا، میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہو گا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اور اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے، میرے ہاتھ لگے میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کر دیا، آہ بھرا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہو بیگم صاحب کے عزیزوں سے ہیں، وشیعہ پاستے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:- لگے نوکر دوں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب:- اکثر مر گئے، نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا، بالکل نیا انتظام ہے۔

میں:- لگے نوکر دوں میں ایک بڑے جمدار تھے۔

نواب:- ہاں تھے، مگر تم کیا جانو؟

میں:- غدر سے پہلے میں ایک محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔

انہوں نے میری بڑی غلطی کی تھی۔

نواب:- وہی جمدار نا! جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں:- مجھے کیا معلوم؟ (دل میں، ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے!)۔

نواب:- یوں تو کئی جمدار تھے، اور اب بھی ہیں، مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں:- ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب:- تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں:- اسی دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے۔ بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب:- جمدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی، میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محفوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی، گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے

اختیار ہی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا، اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں

کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت پرانا اہلی کا درخت تھا، اسی

کے بیچے نمگیرہ تانا گیا تھا۔ گرد تھامیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی دیے تھے۔

تھا توں کے بیچے اور سامنے کھریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بیجے شروع ہوا، بارہ بیجے تک

رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امنڈا چلا آتا تھا۔ صاف یہی جی میں آتا تھا کہ

یہیں میرا مکان ہے۔ یہ اہلی کا درخت وہی ہے جس کے بیچے میں کیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں

شریک تھے۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شب

مٹانے کے لئے میں تھا توں سے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ

وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔

جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گر پڑوں، وہ مجھے لکھ لیں گی۔ مگر جرات نہ

موتی تھی، اس لئے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے بہت ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے

باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمدار کی لڑکی کا نکل

جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر

میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ ایک نگر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!

اسی ادھیڑ بنیں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا ”تمہی لکھنؤ سے آئی ہو؟“

ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)۔

عورت۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ، تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں اچھا کہہ کر اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سوسن کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا، اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہوئیں۔

ایک۔ لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں۔ جی ہاں۔

دوسری۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن، مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی۔ تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے، جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی۔ تو کیا بچھے کی رہنے والی ہو؟

میں۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری۔ کیا تم ذات کی پتہ پتا ہو؟

میں۔ ذات کی پتہ پتا تو نہیں ہوں، تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی۔ (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رکھنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا، اس نے میرے منہ کو

ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کر دوسری کو دکھایا ”کیوں، ہم نہ کہتے تھے وہی ہے؟“

دوسری ”ہائے میری امیرن“ کہہ کے پٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں بیچیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکر چھڑایا۔

اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھی رہیں۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجھے کا داپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر میرا جو حال رہا خدا ہی پر فوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پلنگ پر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدھی رات گئے ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت، کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے میں آیا۔ میں نے حقہ بھر دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ملا کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان۔ کل تمہی مجھے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھج گئی)۔

میں۔ ہاں۔

استنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان۔ (سر اچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا؟

میں۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان۔ ہم سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں۔ بے غیرت زندگی تھی، نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے!

جوان۔ بیشک۔ اس زندگی سے موت لاکھ درجے بہتر تھی۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا

تھا یا کچھ کھا کے سو رہی ہو تھیں۔

میں۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی اور نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی، اب سہی۔

جوان:- اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آئیں۔ اور آئی بھی تھیں تو اس محلے میں مجھے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں:- ہاں اتنی غلط ضرور ہوئی، مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان:- اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں:- اب کیا ہوتا ہے۔

جوان:- (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے! اب (چھری کمرے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے۔ گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے۔ ”ارے دوزو، بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔“

جوان:- (چھری گلے سے ہٹا کے، ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی۔۔۔۔۔ استنا کہہ کے دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی، جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کھجے پر پہنچا تھا اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا، میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک پیچیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان:- (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں:- کل چلی جاؤں گی، مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتا۔

جوان:- بس اب دل سے دور رکھو، معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا، میں نہ ہوا، نہیں تو اسی وقت دارا نیارا ہو جاتا۔ محلے بھر میں چرے ہو رہے ہیں۔

میں:- تم نے دیکھ لیا، جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو! خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان:- برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں:- اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی، ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

”یہ کون تھے؟“

میں:- رنڈی کے مکان پر ہزار آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے، تمہیں کیا؟

بہر طور ماما کو نال دیا۔ رات کی رات سو رہی، صبح کو اٹھ کے لکھتو چلنے کی تیاری کی، شاموں شام شکرم کرائے کر کے روانہ ہو گئی۔

حصہ سوم

(1)

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں
 لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک، وہی کمرہ، وہی ہم ہیں۔ اگلے آنے والوں میں
 سے کچھ لوگ کھلتے چلے گئے تھے، کچھ اور شہرہوں میں نکل گئے تھے۔ شہر میں نیا انتظام، نئے قانون
 جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دھس بنے ہوئے تھے۔ گول
 دروازے سے لے کر دریا تک دور دور مکان کھدے ہوئے پڑے تھے۔ جا بجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل
 رہی تھیں۔ گلیوں میں کھرنجے بنائے جاتے تھے۔ نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرضیکہ لکھنؤ
 اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

دو چار مہینے خانم کے مکان پر ہی رہی۔ اس کے بعد بہ لطائف الحیل ایک علیحدہ کمرہ لے کر رہنا
 شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی
 بے پردائی سی ہو گئی تھی۔ جو رندیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں
 ان کے روپے پیسے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ
 گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اس زمانے میں نوب محمود علی
 خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کئے۔ پھر لوکر رکھا، اس کے بعد مجھے
 پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور اپنے قدم ملنے والوں سے ملاقات
 ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب
 صاحب نے عداوت میں زحمت کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمے کی

بیرونی میں ہزاروں صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مددگاروں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی، یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں۔ ”مار ڈالوں گا، ناک کاٹوں گا“۔ اس زمانے میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لئے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں، یہ آدمی فینس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوج داری میں چمکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ بے شک نواب صاحب درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے چمکے لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی، خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا، ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ، چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروائیوں میں مشاق، جعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحید عصر، عدالت کو دھوکہ دینے میں یکتائے زمان، میری طرف سے پیرد کار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نواب صاحب سے سر پر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا، مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لئے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا، لیکن مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کئے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گئے پڑے ہوئے، بڑے بڑے علمائے سرپر، عبائیں زیب دوش، ماتھوں میں کنٹھے، پاؤں میں کنٹھیں، بات بات میں قال اللہ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ نلج کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق، جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے، اور انہی گواہوں کی گواہی سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوج داری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے تھے، وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے، بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمدورفت میرے مکان پر بہت زمانے تک رہی۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک جہ نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ برے آدمی بالکل برے نہیں ہوتے، کسی نہ کسی

سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہو گا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس سے پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کس کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ رہا میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بیجا ہوا ہو، خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خاں ایک مرتبہ صبح کو کچہری جاتے وقت اور پھر شام کو کچہری سے پلٹ کے میرے مکان پر آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگوانے کی کیا ضرورت، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انہی کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانے میں میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیر داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا۔ یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لئے اتنا مجھے کہہ لینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ۔ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا۔ عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے، اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو)۔ جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر ان کا برا اثر پڑا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہو گا۔

بے خور و مصحف بوز و آتش اندر کعبہ زن

ساکن بت ظلم بائش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان! یاد رکھو مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے۔ اس کی بخشش کہیں نہیں ہے۔ اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔

امراؤ۔ میاں، میرا تو بال بال گناہ کار ہے، مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا۔ مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہو گی؟

امراؤ۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے،

ہزاروں اڑائے۔

رسوا:- پھر اس کی کیا سزا ہوگی؟

امراؤ:- اس کی سزا نہ ہونی چاہئے۔ ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا:- کیا خوب!

امراؤ:- فرض کیجئے ایک صاحب نے ہم کو پیلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لے مل نہیں سکتے۔ ان کا دل دکھتا ہے، پھر اس میں ہمارا کیا قصور! دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے، اپنا دل۔ ان کی جان پر بنی ہے۔ پھر ہماری بلا ہے۔ بعض ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ فقط ہمیں چاہو ہم نہیں چاہتے۔ اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا:- یہ سب گولی مار دینے کے لائق ہیں۔ مگر برائے خدا! کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجئے گا۔

امراؤ:- خدا نہ کرے۔ آپ خوش باشوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں، نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا:- یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے اور نہیں بھی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراؤ:- میں منطوق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا قتل مندی کے ساتھ ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا:- اس کی مثال؟

امراؤ:- پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں، میں آپ کو۔

رسوا:- خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلئے، دوسری مثال۔

امراؤ:- خیر اگر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے۔ جیسے فریاد رس الہی۔

رسوا:- نہیں اس مثال پر آپ نے غلطی کی۔ اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ:- اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا:- آپ بھی کیا دنیاؤسی مثال ڈھونڈ کے لائی ہیں۔

امراؤ:- اچھا جیسے۔۔۔۔۔ نظیر۔۔۔۔۔

رسوا:- (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شریاد آیا ہے، سن لیجئے اور اپنا قصہ دہرائیے۔

امراؤ:- کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے
ہاں وہ کلکتے والا معاملہ؟

رسوا:- اتنی دور کہاں پہنچ گئیں۔ کیا لکھتو میں ایسے نہیں رہتے؟

امراؤ:- دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا:- ہاں میں نے سنا تھا، آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں؟

امراؤ:- مجھ سے سنئے، جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے ہیں اور میں روپوش ہوئی ہوں، اس زمانے میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان پر لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی، دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا:- میں بتا دوں؟

امراؤ:- گوہر مرزا؟

رسوا:- جی نہیں!

امراؤ:- تو پھر اور کون؟ بتائیے۔

رسوا:- آپ بتائیے۔

امراؤ:- ایسے فقرے کسی اور کو دیجئے گا۔

رسوا:- فقرہ کیا! میں ایک پرچے پر لکھ کے رکھ دیتا ہوں، پھر آپ بتائیے۔

امراؤ:- بہتر۔

رسوا:- پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہئے۔

امراؤ:- تیسرے میں خود۔

(پرچے میں لکھا تھا "آپ خود")

امراؤ:- واہ مرزا صاحب! خوب پہچانا۔

رسوا:- آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گزری؟

امراؤ:- گزری کیا، سنئے۔

اول تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان تھی۔ موکچا سا مکان، ایک چھوٹی سی دلیہ، آگے چھپر۔ ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے؟ باورچی خانہ اور سب غائبے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا چاہیں۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین چھوٹے ہی "بھوجی" کہنے لگے۔ ان کے بے شکے پن نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے تنگ ہو گئی۔ ہر سٹے "بھوجی پان نہ کھلاؤ گی؟"

ایک دن دو دن، آخر مدت کہاں تک۔ انتہا یہ کہ پان دان میں نے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہو گئی۔ انہوں نے قبضہ کر لیا، جیسے کوئی مال موردی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بد تمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چوڑے کی کھسیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں، زبان سے پاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا، چکنی کے چورے اور الائچی پر ہسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ سا جھانگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر کھانے کے وقت ضرور تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں۔ اکبر علی خاں کے برادر نسبتی تھے۔ ان کے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ دن رات قانون چھٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو اک ذرا امن ہو جاتا تھا، کیونکہ انہیں مقدموں کی باتیں سننے سے نفرت تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں، کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی کسی مقدمے میں فیض آباد گئے، افضل

حسین اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کی کنڈی بند کر لی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی، جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی، کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نہ خواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چٹکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا۔ "یا اللہ بیٹھ جاسیے۔" بارے بیٹھ گئیں۔

میں:- ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج ادھر کہاں تشریف آئی۔

بیوی:- تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔

میں:- جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم تو مناسب بھی ہے۔

بیوی:- لے باتیں نہ بناؤ۔ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے۔ اور سچ پوچھو تو نہ میرا نہ تمہارا، گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں:- جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو، ان کا بھی ہے اور آپ کا بھی۔

بیوی:- یہ تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں میاں کا حکم ہو گا۔

میں:- میاں کے حکم کی کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی، وہ حاصل ہو گئی۔ اب حاضر ہوں گی۔

بیوی:- اچھا تو چلئے۔

میں:- چلئے۔

مکان میں جا کر جو دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے میکے، دیگ، لگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فردش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جابجا کوڑا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چکے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا ہلکا من نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چوڑے کے دھول میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا، میں نے چٹکی میں دبایا، باتیں کرنے لگی۔ اسی اثناء میں حملہ کی ایک بڑھیا آنکلی۔ زمین پر پھسکوا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

بیوی:- اب تمہیں کیا بتاؤں؟

میں چپکی پٹھی رہی۔ بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے)

بڑھیا:- ادنیٰ! بیسے میں جانتی نہیں۔

میں:- بڑی بی! پھر جانتی ہو تو پوچھنا کیا۔

بڑھیا:- ادنیٰ بی! تم سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں۔ میرا منہ تم

سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی:- ادنیٰ بڑھیا! ذرا سی بات میں جھگڑا کاٹنا ہو گئی۔

بڑھیا:- (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں۔ اے لو، ہم تو ان کی

بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں، یہ سبھی سے الگ بگڑتی ہیں۔

بیوی:- لے بس، اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا! تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو؟

بڑھیا:- ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہونا جائے گا۔

بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔

بیوی:- کیوں نہیں، اے تم بھی میری سوت ہونا۔ (میری طرف مخاطب ہو کے) سن لو، خان

صاحب کی پہلی بیوی ہیں۔ لو بیوی تم اصل میں ان کی سوت ہو۔ میں تو ان کے بعد آئی

ہوں۔

بڑھیا:- وہ سوت ہوں اپنے ہوتے سوتوں کی۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ منہ در منہ گالیاں

دیتی ہو۔ موئی کسبوں، فانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی۔ اتنے دن مجھے آنے

ہوئے، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں کہی۔ بہو

صاحب گنونتی ایسی ہیں کہ محلے کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں۔

بیوی:- (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا بدن کی ماں! تم آج سے میرے پاس نہ آنا۔ وہیں

بڑی بیگم کے پاس جا کر بیٹھا کرو۔

مجھے بھی بہت غصہ تھا، مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ کون لگے،

ضبط کر کے چپکی ہو رہی۔

بڑھیا:- ہماری بلا آتی ہے۔۔۔۔۔

بیوی:- موئی کی ساتھی آئی ہیں۔ یہ بلا بوجھ کیا بک رہی ہے۔

بڑھیا:- تو کیا تمہارے دلیل ہیں؟ کچھ کسی کے لینے میں نہیں۔ گھڑی بھر نکل آتے تھے۔ تم

ہم سے ہم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے۔

بیوی:- ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا:- اس ضد پر تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بنا لیتی ہو۔

بیوی:- آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔

بڑھیا:- کیا تاکت، کیا مجال۔ منہ بنوؤ۔ جوتیاں ماریں گی، بڑی بے چاری۔

بیوی:- لے اٹھو، یہاں سے ٹہلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔

بڑھیا:- (ایک فحشا لگا کے) آج تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔ مارو بڑے باپ کی بیٹی

ہو تو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھر تھر کانپنے لگیں۔

بیوی:- دور ہو یہاں سے، کہتی ہوں۔

بڑھیا:- اب تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔

بیوی:- (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں

گی۔

میں:- بیگم جانے دیجئے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا:- (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا۔ مال زادی، تجھے کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی:- (جوتی پیر سے لے کر ایک دو تین۔ اب راضی ہو؟

میں:- بیگم جانے دیجئے۔ (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی:- نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا:- اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر چار پانچ اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں

پھیلا دیئے اور دو ہتھوڑا مارنا شروع کیا۔ ”ہے ہے! ہے ہے! مجھے جوتیاں ماریں۔ اب تو دل ٹھنڈا

ہوا۔ سوت کی ہلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مارا! ہائے مارا۔“ چلا چلا کے وہاں دینا شروع کیا۔ باورچی

خانے سے بوا امیرن الھ کے دوڑیں۔ بیگم صاحب اپنے دالان میں چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہو گئی۔

بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دو ہتھوڑا مارنا شروع کئے۔ ”اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں۔“

بیگم صاحب نے مجھے کیا معلوم تھا کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ نہیں تو آکے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔ ارے اس نے مار کھلوائی۔ میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا، کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی۔ پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔
بڑھیا۔ ہم تو نام لیں گے۔ دیکھیں تم کیا کرتی ہو۔
بیگم صاحب۔ آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا۔ مجھ نگوڑی نے اسنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا کیا گناہ کیا؟
بیوی۔ تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں، پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟
بڑھیا۔ کیا مطلب تھا؟ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو کسی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم۔ چل شفتل، تو کیا بدلہ لے گی؟ ذرا کسی بھلا دے پر نہ پھوننا۔
بڑھیا۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہو کہہ لو۔ تمہارا ہک ہے۔
بیگم۔ تیری ہک والی کی ایسی تھی۔ نکل۔ یہاں سے۔
بڑھیا۔ لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔

(یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی) بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں۔ دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں۔

بیگم۔ (ہوئے) آخر تم اس موٹی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟
بیوی۔ اماں جان! آپ کے سر کی قسم! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھری کھٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سینکڑوں بائیں تو ان سے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو

ناگوار نہیں ہوئی، کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی، مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب۔ (میرے چلے آنے کے بعد، ہوئے) اوہی پٹنا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا، پھر موٹی ایک شفتل بازاری کے لئے۔ آخر تمہیں اس کی پرچک لینا کیا ضروری تھی۔

امیرن۔ اچھا اس کو جانے دیجئے۔ جیسی اس نے بد زبانی کی تھی، اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھئے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیسا؟ اور کسی بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی کیسی ماناست ڈالتی۔ اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں؟

بیگم۔ (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر جس کا جی چاہے آئے، گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔ اے لو ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں۔ میں نے نہیں ہائی بھری۔ بوا امیرن! میں یہ سوچتی کہ آج کو مہمان طریق کھڑی تڑی چلی آئے گی، کل کو میاں گھر میں بٹھالیں گے۔ تو یہ چھاتی پر مونک کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ سے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن۔ سچ ہے بیگم صاحب! اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والیوں کا گھر گرہ مستیوں میں کام ہی کیا ہے۔ لڑکے لوگ کہتے تھے: ایک درجہ مرد کو گھر میں بلا لے، بد عورتوں کو نہ بلائے۔
بیگم۔ بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے، بھاگڑے کے دنوں میں برسوں حسین خاں ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا سہنا رہنا، مگر مجال ہے کہ انہوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو، یا بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحیحی میں گھٹی بیٹھی رہتی تھی۔ اماں اصلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن۔ ایک تو یہ کہ تم صحتک کی کھانے والی بیوی صاحب زادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی، کہاں تک براؤ ہو گا۔ کہیں اس نے کتھے چونے کی کھسیوں میں ہاتھ ڈال دیا،

تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا! دوسرے موٹی نکلیاں ان کا ایثار (اعتبار) کیا؟ سینکڑوں عارضوں میں گھری ہوئی ہیں۔ ان کی تو پرچھا دیں سے بچنا چاہئے۔

بیگم صاحبہ۔ ایک بات؟ کبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہئے۔ پرچھاؤں، ناگھن، ٹوٹے، ٹوٹے۔ بوا، کون کہے۔ ان کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمود علی کی بہو کو سوت نے جو تک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن۔

بیگم۔

جی ہاں! اے لو کیا میں جانتی نہیں۔

یہ سوتا پے کا ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ اس میں جہاں تک الگ تھلک رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلک رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو۔ اس موٹی ٹکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی؟ دعا، تعویذ، گنڈے، کیسے کیسے نقش میرے سر ہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن۔

بیگم۔

پھر اس۔۔۔۔۔ کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا۔

اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سکا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا، میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن۔ مگر بیگم! ایک بات کہوں گی خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم۔ یہ خوب کئی۔ میاں کو پھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گزری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں میاں سے تھی۔

امیرن۔

بیگم۔

(قہقہہ لگا کے) نہیں بیگم صاحبہ!

کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن۔ بہو صاحبہ! تو پھر آپ کو نہیں چاہئے تھا۔ سسرے کی حرم کو اپنی جوتیاں۔۔۔۔۔

بیگم۔ بوا! ان لوگوں کو یہ لٹاؤ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی، ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ آج کو موٹی نکلیائی کے چلتے سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں، کل ماس کو ماریں گی۔

امیرن۔

نہیں خدا نہ کرے۔ مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحبہ بے چاری کو ایسے کوٹے دیئے کہ آخر بیچیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوج

لوں۔

رسوا۔

ہائیں ہائیں یہ غصہ!

روکے گا ذرا طبیعت کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو

مرزا صاحبہ! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو احتیاج ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

امراؤ۔

رسوا۔

میرے نزدیک تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور مدن کی ماں بے چاری ناقص تھی۔ حق تو یوں ہے، اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

واہ مرزا صاحبہ! آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

امراؤ۔

رسوا۔

جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا تھا۔

ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

امراؤ۔

رسوا۔

ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ۔

مدن کی ماں پر خوب جھنجھو، خوب چلائے کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خان صاحب آئے تو پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا۔ وہ اگلے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا۔

امراؤ۔

بڑھے کی عقل صحیح تھی۔

صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے! ذرا مدن کی ماں یاد دہرایا کرتی تھی، اسی سے اس کی پرچک لیتے تھے۔ کیوں نہ پرچک لیتے، مدن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا۔

پھر آپ ہی قائل ہو جیئے۔ یہ عین دھخ داری تھی۔ اچھا اب ایک بات اور بتا دیجئے۔

مدن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا گھر گریست۔ اور بوا امیرن کون تھیں؟

دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لئے وہ رڈ ما اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے۔ اس لئے ان کی اولاد سے بہت ہی چھپے چوری ملتی ہیں۔ اور شہروں میں تو آزادی ہے۔ کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ:- مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں، مثلاً میاں ارشاد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا:- اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو ان کا چرکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

(2)

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

رسوا:- ہاں! وہ آپ کی فوجی کیا ہوئی؟ اے بھلا سا نام تھا۔

امراؤ:- آبادی؟

رسوا:- آبادی۔ صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔

امراؤ:- مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا:- یاد کو کیا چاہئے۔ واقعے میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراؤ:- تو یہ کہئے کہ آپ بھی بی آبادی کے امیدداروں میں تھے۔

رسوا:- سنو، امراؤ جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے، مجھے

ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدداروں میں نام لکھوادینا اور جو (خدا نخواستہ) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراؤ:- اور اگر کوئی مرد حسین نظر آئے؟

رسوا:- اپنا نام اس کے امیدداروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدداروں میں لکھوادینا، بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراؤ:- کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا:- شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فرد گناہت نہیں کی گئی۔

امراؤ:- سیدھی سی ایک یہ بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے نہیں، عرفاً درست ہے

رسوا:- یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو درغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔

امراؤ:- بھوان اللہ!

رسوا:- خیر اب اس فضولیات کو رہنے دیجئے۔ آبادی جان کا حال کہئے۔

امراؤ:- مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا۔

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

کہاں کی پاک بازی، ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ شکل و صورت نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا:- اب کیا ہوئی۔ خدا کے لئے جلدی کہئے۔ مرج شہر چلی گئی، مر گئی، آخر آفت ہی کیا ہوئی

جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ:- ہم سے گئی جہان سے گئی۔

رسوا:- آخر ہے اب کہاں؟

امراؤ:- اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا:- یہ کہنے کل جوانی شگفت۔

امراؤ:- جی مادر اللہ سے خوب پھلیں پھولیں۔ صورت بگڑ گئی، رنگت اٹا تو ہو گئی، ناک پیٹ

گئی، تمام بدن میں چٹھے پڑ گئے، بال گر گئے، غرضیکہ ستر کرم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا:- یہ ہوا کیا تھا؟

امراؤ:- اے ہے، ہوا کیا تھا۔ موٹی لونڈوں گھیری، سفلی، چچھوری۔ میں نے بہت چاہا کہ آدمی

بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ استاد کو نوکر رکھا، تعلیم دینا شروع کی، مگر اس کا

دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی، میں نے کمر اٹھا کر دیا تھا۔

شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات عالم گلوچ، دھیتکا مشتی، جو تم

جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں۔ جو آیا وارد۔

میں نے مارا، پیٹا، سمجھایا، مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اس

زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جنم آیا کرتا تھا۔ اس سے کہیلا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا

بچے ہیں، کیلئے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جنم کی آمدورفت موقوف

ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گویا

کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان سے تھے مگر طبیعت پاجی

تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا، نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سرشام کیا دیکھتی ہوں، ڈیوڑھی

میں بنی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب:- اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں۔ امراؤ جان سے

ڈرتا ہوں۔

آبادی:- ہٹو! ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کا ہے؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "عالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔"

آبادی:- پھر تمہیں کیا؟

چھٹن:- (ایک بوسہ لے کر) ہمیں کیا؟ جان جاتی ہے، مرتے ہیں۔

آبادی:- موئے چار آنے تو دیئے نہیں جاتے، مرتے ہیں! مرتے سب کو دیکھا، جنازہ کسی کا

نہیں دیکھا۔

چھٹن:- چار آنے؟ جان حاضر ہے۔

آبادی:- نگوڑی جان کو میں لے کر کیا کروں گی؟

چھٹن:- لو ہماری جان کسی کام کی ہی نہیں۔

آبادی:- لے اب باہیں نہ بناؤ۔ چوٹی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن:- واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی:- اچھا تو جان چھوڑو، جاؤ۔

چھٹن:- اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے

پڑے ہوئے تھے، نکال لئے۔

چھٹن:- تمہیں ہمارے سر کی قسم! یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔

آبادی:- تمہارے سر کی قسم! میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن:- آٹھ کیا کرو گی۔ پرسوں چوٹی لے لینا۔

آبادی:- واہ! فاگینہ لیں گے۔

چھٹن:- تین پیسے کا فاگینہ! اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی:- تین پیسے کا فاگینہ کچھ بہت ہوا؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے۔ بیوی لینے نہیں

دیتیں۔ کہتی ہیں پیٹ میں درد ہو گا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنے کا فاگینہ کھا

گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

(میں نے دل میں کہا، کیوں نہ ہو۔ موٹی کال کی ماری بلا نوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھالیں تو بد

ہضمی ہو جائے۔)

رسوا:- کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ:- جی ہاں! ایک روپیہ کوماں بچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقے سے تھی۔ میں نے روٹی

کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا، میرے پاس رہ مگر نہ رہی۔

رسوا۔ کم بخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ۔ جی! کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی۔ سال میں ایک دو مرتبہ آجایا کرتی تھی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی، خدا جانے جیتی ہے یا مر گئی ہے۔

رسوا۔ ذات کیا تھی؟

امراؤ۔ پاسی۔

رسوا۔ اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں۔

امراؤ۔ میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے منہ ہی منہ میں موٹی کو خوب کپلا۔ پیسے پھین کے چوک میں اچھال دیئے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کوئی دو روپے مہینے کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آکے رہتی تھی حنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ساری خصلتیں حنا کی اس نے اختیار کر لیں۔ جیسی وہ رنڈی تھی دیسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا، پاؤ بھر پوریاں تیل کی لئے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سینکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز نیون کی فرمائش ہے۔ تمہلی بوٹ کا چوٹکا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے۔ کف دار کرتے یا انگرکھے کمر کے پاس سے چست۔ کوئی دھوتی باندھے ہے، کوئی چست گھٹنا ڈالتے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حنا ٹھک ٹھک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ برن والی سرا میں جا کے ایک بوتل ٹھہرے کی آڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے، لاکھڑاتے، ناچتے، گاتے۔ بی حنا ابھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سر راہ کالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جو تم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے میں گر پڑے، تین چار میلے تک پہنچے۔ وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار ہوا اس نے بی حنا کو کانٹہ لیا، اور یاروں کی دھتائی۔ اپنے گھر لے گیا یا انہی کے کمرے پر آکے ٹھہرا۔ اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے، کمرے کے بیچے کھڑے چنچ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں، ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حنا دل تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا

آیا۔ اس نے مجمع حلاف قانون کو برہم کیا، سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

سب یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی۔ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے، ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئیں۔ اس کے گھر جا کے بیٹھیں۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی، گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انہیں پرواہ نہ ہوئی، مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکاوے۔ بی آبادی کو چوہا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہر طور چند روز یوں گزرے۔ یہیں ایک بچہ جنس۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینے کا بچہ وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپے مہینے کی ڈگری ہو گئی۔ تین روپے نواب دیتے تھے۔ ڈیڑھ روپے میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے منے کے ساتھ بھاگیں۔ اس لڑکے کی ماں پٹھانی، کٹنی بڑی مشہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لقمہ دریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا بھی ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر وسعت ہوئی۔ منے برائے نام رہ گئے۔ میاں منے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت، پٹھانی کو جل دے کے انہیں وہاں سے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا۔ وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہٹکایا کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے محمد بخش گلو کھجور کے بیٹے سے راہ و رسم پیدا کی۔ بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا۔ اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمت گاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بیٹی میں طاق تھے، اڑالے گئے۔ انہوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھیلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں۔ اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوا دیا۔ بالفضل وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ اگر آپ فرمائیے تو بلوادی جائیں۔

رسوا۔ مجھے معاف ہی کیجئے۔

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی
دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی، چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی کریں۔ سرشام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو مردانی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر مہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں، حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے، انہیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے۔ انہوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنائی درگاہ میں بھی ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائیں گی۔ اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چوپیلے پر پردہ ڈال کے زنائی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محل دار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی۔ میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے، شکایتیں، غدر کے حالات، ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں، دہنی طرف کی صحنی سے کان پور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے، چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پانچے سنبھالے ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک لوثیا خاص دان لئے ہے، ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیگم۔ اللہ امر! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کان پور سے جو غائب ہو نہیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔

میں۔ کیا کہوں۔ جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی، اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آ کے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتا تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم۔ خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں۔ لکھنؤ کیسا، اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم۔ اس کی سند نہیں۔ تمہیں میرے مکان پر آنا ہو گا۔

میں۔ سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟
بیگم۔ چوپٹیوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب

اتے ہیں ایک مہری بول اٹھی "نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔"
میں۔ آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم۔ نہیں۔ وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر تمہارے واسطے؟ میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انہوں نے خود تمہیں کان پور میں کئی دفعہ ڈھونڈ دیا۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں۔ اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم۔ کب آؤ گی؟ وعدہ کرو۔

میں۔ اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم۔ ادنیٰ۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں۔ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں۔ اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی۔

بیگم۔ اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے چلے جائیں۔

میں۔ مناسب ہے، اتوار ہی کو سہی۔

بیگم۔ کس وقت آؤ گی؟

میں۔ جس وقت کہیے۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں، ہر وقت برابر ہے۔

بیگم۔ تم کہاں رہتی ہو؟

میں۔ چوک میں سید حسن خاں کے چھانک کے پاس۔

بیگم۔ اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں۔ یہ بہت اچھا ہے۔

بیگم۔ اچھا تو خدا حافظ!

میں۔ خدا حافظ! ہاں تو کہئے، صاحب زادہ کیسا ہے؟

بیگم۔ نہیں؟ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ نواب تم نے یاد کیا۔

میں۔ کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

بیگم۔ اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھلا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا۔

میں۔ رات کی نیند حرام۔ لے اب کچھ نہ کہئے۔ خدا حافظ!

بیگم۔ خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔

میں۔ ایسی بات ہے؟

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر پلا، کہنے لگی ”بیگم صاحب! چلئے، دیر سے سواری لگی ہے۔ کہاں موئے چلا رہے ہیں۔“

(4)

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز

دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی، مگر جب تک وہ جیتی رہیں انہیں اپنا سرپرست سمجھا کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا، مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوہجی کو اپنے ساتھ سے جدا نہ سمجھتی تھیں، مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دیئے، اس لئے اس سے انہیں نفرت سی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آگئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرے لیا تھا، مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمر خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا دو دو تین تین دن دیں جا کے رہتی۔ سال بھر کہیں رہوں، مگر محرم میں تعزیه داری دیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیه خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ جمعے کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے،

تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انہیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ تھا کہ جی میں آیا ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمر اکھولا۔ دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے۔ فرش فردش الٹا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے لنگے دن یاد آئے۔ اللہ ایک وہ دن تھا کہ یہ کمر ابر و قنوت کیسا سجا سجا یا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی۔ بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام تک نہ تھا۔ تنگنک کہیں پڑا نہ رہتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی، اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ذرا جالے تو لے لے۔“ وہ ایک سیٹھا کہیں سے ڈھونڈ کے اٹھالایا۔ جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کر دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھروائے۔ کوٹھری میں سے سٹار دان، پان دان، اگال دان اٹھا لائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس غاص دان تھا۔ پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آگیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت، غرضیکہ جو صاحب اس کمرے میں آتے تھے، مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمر اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صبح میں نظر سے گزر گئیں تو یہ دروازہ سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دور جلد جلد ہوئے، اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے، ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے دماغ کو چکر ہوا تھا، تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی دمکت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجھے کا تمام جلسہ، جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا پھر انکا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعر و سخن کا چرچہ خان صاحب کا محل صحبت ہونا، بد زبانی کرنا، سلطان کا تمغہ مارنے خان صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جان نثاری، کو تو ال، کا آنا، خان صاحب کو

گھر پر بھجوا دینا، مگر پھر سلطان صاحب کا نہ آنہ محفل میں ان کو دیکھنا، لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا، پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے۔ مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا تو طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی: بیوی! دیکھئے، وہ کنکھجور آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔

میں ادنیٰ کہہ کے اٹھی۔ جلدی سے دوپٹا اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹا اتار کے جھاڑا۔ کنکھجور اپٹ سے گرا اور رنگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی: (بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں! اے لیجئے، یہ کیا ہے!

میں: (دل میں) اہ! اشرفیاں ہیں! (آدمی سے) اشرفیاں ہیں!

آدمی: واہ! اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں: (ہنس کے) وہ کنکھجور اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو ہجکا، پھر پانچوں اشرفیاں مجھے حوالے کیں۔

رسوا: تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ: لٹا کیوں نہیں۔ مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایہ کسی نے اٹھا کے نہیں دیکھا۔

رسوا: ممکن ہے۔

سمجھتی تھی کھانا دانا کھا کے جانا ہو گا۔ مہری نے کہا: "بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا نہیں آکے کھانا"۔ میں نے پوچھا "نواب صاحب گھر پر ہیں؟" اس نے کہا: "نہیں۔ صبح اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔" میں نے پوچھا: "کب آئیں گے؟" مہری نے کہا: "اب آئیں تو کہیں شام کو آئیں۔" مجھے بیگم سے تھکنے میں بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو، کنکھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ملا کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا، بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ دسترخوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحب نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پرائے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چادلوں کا خشک، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلہ سوہن، کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم: کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں؟

میں: چپ بھی رہو۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔

بیگم: سن لے گا تو کیا ہو گا۔ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔

میں: برائے خدا چپ رہو۔ کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے منہ ہاتھ دھویا، پان کھایا، مہری نے حمہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں: بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم: جب تمہیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا، اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی رہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے؟ کیوں کر دیکھا ہے؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ اسے میں کریم مہری پر نظر پڑی۔ کریم کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آگیا۔ دل نے کہا: اوہو! انہیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں: میرا بھی یہی حال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ دالیوں میں خورشید ہے۔

(5)

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیا رشک

ملیں گے آج ہم ان سے رقیب سے مل کے

اتوار کے دن 8 بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کھارے کے سر پر سزا دل ہو گئی۔

میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حہ پینے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں

اس کی صورت، تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی، تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم۔ اب میرا حال سنو۔

میں تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عہدۃ النسا بیگم صاحب کے ہاتھ لگی ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولہواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نا اتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نا اتفاقی تھی، اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا لے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ نساہز ہوئی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہئے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جاہداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہی کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت میں بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہے۔ میری ظاہر میں تو کبھی کسی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوستوں آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔ کچھ ان کے پیچھے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی، خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا نین کو پردان چڑھائے۔ ہو بیاہ لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی، مجھے اپنی قسمت پر افسوس آ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی: تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر، مکی بھی تو کہاں، رنڈی کے گھر میں۔ اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تحلیلہ کی

باتیں ہو چکیں، نوکروں کو آواز دی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گلے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلی تھیں تو وہ رام دئی تھی اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے وہ پھر بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجاتا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجالاتی تھیں۔ جب میں گا چکی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا، اس کو گویا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

(6)

ہاں اے نگہ شوق مناسب ہے احتیاط

ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ، سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قریبے سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کر حلقہ بن کے بیٹھ گئی۔ جس دہان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، وہاں سے دروازے کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کر کہا: ”نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔“ چند لمحوں کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ نواب اندر داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں کہتی تو ہیں) (سلامان صاحب) ہے! کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ سچل، پھر بخور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جو ان کی طرف تو حیرت سے

مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دہان کے قریب پہنچ گئے اور میری طرف دیکھتے جاتے تھے کہ۔

ہجرت کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے
موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ
غفلت میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر مٹا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شریاد نہیں۔ مقطع یہ ہے۔

کیا غزل کوئی کمی ہے۔۔۔۔۔
آج کیوں باد صبا یاد آئی

(7)

جھولا کن ڈارورے امیریاں

برسات کے دن ہیں۔ پانی جھاگم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے۔ میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگا جان، خورشید جان، رندیوں میں۔ نواب بہن صاحب، نواب چھٹن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، آفتاب حسین، اکبر علی خاں، مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں، گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں۔

بسم اللہ جان۔ بھئی ہو گا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیسا مینہ برس رہا ہے۔

میں۔ ادھر۔ بازار سے جو جی چاہے منگوا لو۔

خورشید۔ بازار سے منگوا لو، خوب کمی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزہ ہی اور ہے۔

امیر۔ بہن! تمہیں ہنڈیا مھونکنے کا مزہ ہے۔ ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے، نہ پکانے کی قدر

بیگم۔ ادنیٰ نواب، دیکھتے کیا ہو؟ یہ وہی ہیں امراؤ جان جو کان پور.....
اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس اثنا میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ میں بول سکتی ہوں۔ منہ سے بولنے کا تو موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت، رمز و کنایت، سب اشاروں میں ہوا۔

نواب۔ (کسی قدر احتیاط سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کان پور میں اس شب کو تمہاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں۔ یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب۔ خیر وہ کچھ ہو، وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک خیریت ہو گئی۔ تمام ضروری کاغذات کو فحی میں موجود تھے۔

میں۔ یہ حضور ان دنوں جھگڑے میں غورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب۔ کیا کہوں، ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جاہلاد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتے جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا، نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں۔ وہ کو فحی ایسے جھگڑے میں ہے کہ جو واردات ہو تعجب ہے۔

نواب۔ سوائے اس واقعے کے اور کوئی واردات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا۔ بد معاشوں نے سراٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا ہوا تھا۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ جب حد پان سے فراغت ہو چکی، نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

جانتے ہیں۔

بیگا۔ تو پھر دہلی بازار کی ٹھہری۔

میں۔ اسے ہے باجی کیا بھوکی ہو؟

بیگا۔ میں تو بھوکی نہیں ہوں۔ بسم اللہ سے پوچھو جس نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ۔ بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہئے۔

میں۔ میں بتاؤں! چلو بخشش تالاب چلیں۔

بسم اللہ۔ ہاں بھئی کیا بات کہی ہے۔

خورشید۔ خوب سیر ہو گی۔

بیگا۔ ہم بھی چلیں گے۔

میں۔ اچھا تو سلمان کرو۔

بات کرتے تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سلمان گاڑیوں پر زور دیا گیا۔ دو

چھوڑا ریاں نواب بن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گوشتی پار پہنچ کے کانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا کانا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں۔ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔

بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔

نالے، ندیاں، جھیلیں بھری ہوئی ہیں۔ مورناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہیں

تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے

لگیں۔ نواب چھٹن صاحب بارانی بہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکالائے۔

اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھوڑا ریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چار پائیاں

آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے

ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مٹتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر

پڑا تو کچھ میں لت پت، تھوڑی دیر میں پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے

مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھوڑا ریاں میں بیٹھیں رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر ان کی پٹیلیں اور سب کا قہقہہ لگانا، دیکھنے کا تماشا تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہتی تین تینیاں آنکلیں۔ ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ

ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ کانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا۔ مگر اس

موسم میں اور ویسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا،

دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے۔

جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج انہی گنجان درختوں کی

آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول

کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی

شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے گھٹلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی

کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس دقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ

خفقانی مزاج کی عورت، جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھوڑا ریاں میں چلی آتی۔ یہ تماشا دیکھتی ہوئی خدا

جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی

کے کندھے پر بل جھلا کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی

تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیدوں بکریوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر

نفروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی کی اکیلی ہی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب

اس سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک اب میں گویا تالاب کی طرف جا رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا

ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرے قدم جلد جلد اٹھ رہے ہیں۔ آگے چل کر ایک فقیر کا

تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں

لکھنؤ کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ تالاب دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بہرہ

میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین

درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی

باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا، کھربانی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میری اس

شخص کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا، پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کم بخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں، اور ضرور ہی گر پڑتی، اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر دلا درخان نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو گا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا حال دیکھ کے کہا۔ ”ہائیں ڈر گئیں؟“ میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش:- وہاں کیا دھرا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہے۔ داد! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا تھا۔

(منہ سے تونہ بولا گیا، میں نے ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا)۔

سلار بخش:- چلم پینے گیا ہو گا تھکے پر۔ اچھا تو چلے۔ نواب چھٹن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ یہ کہئے آپ مل گئیں۔ نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں نے ہاں، نہ کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئے۔

رات کو۔ یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے والے سے فراغت ہو گئی، میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں:- تم نے اچھی طرح دیکھا۔ یہ وہی دلا در علی خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بد معاش کو چل کے گرفتار کرتے۔ بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھود تا کیا تھا؟

میں:- کیا معلوم، موا اپنی قبر کھودتا ہو گا۔

اکبر علی خاں:- اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھونٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا

ہے۔

میں:- (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں کچھ وہاں گاڑ دیا ہو گا۔ اسے کھودنے آیا ہو گا۔

اکبر علی خاں:- چلو دیکھیں۔

میں:- میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں:- میں جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لئے جاتا ہوں۔

میں:- کہاں جاؤ گے؟ اب وہاں کچھ نہ ہو گا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہو گا۔

اکبر علی خاں:- میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھٹن صاحب کی چھو لداری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب:- خاں صاحب! کہاں جاسیے گا؟

اکبر علی خاں:- نواب صاحب! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟

نواب:- جی نہیں۔

اکبر علی خاں:- میں حاضر ہوں؟

نواب:- آئیے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھو لداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب:- (مجھ سے) اور تم اس بد معاش کو کیا جانو؟

میں:- (اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب:- اخلا! آپ بھی فیض آباد کی ہیں؟

اکبر علی خاں:- مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔ ایسے میں۔ یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں

مگر رفتار ہو جائے۔

یہ کہہ کر سلار بخش کو آواز دی، قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا، تھانے دار کو رقم لکھا۔

تھوڑی دیر میں تھانے دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آمو جو ہوئے۔ میں نے جو دیکھا ان سے

کہہ دیا۔ گاؤں سے پانی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈا۔ تھکے پر فحیر سے کسی قدر

سراغ ملا۔ ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔ وہ تھانے دار کے پاس لے آیا۔

تھانے دار:- خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے خوب سگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکان گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تلاب پر پہنچ گیا۔ تلاشی میں چوبیس اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے مہچانا۔ دس بجے چالان لکھتو روانہ ہو گیا۔

رسوا:- اچھا تو پھر اس کا شکر کیا ہوا۔ اس قصے کو جلدی ختم کیجئے۔

میں:- ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا یہاں سی ہو گئی۔ واصل جہنم ہوا۔

اختتامیہ

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کے لئے دیا تھا، مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم رو سیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ ماماں، خدمت گار سب بیچے کے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیپ روشن تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک کردنیں بدلائی۔ چاہتی تھی سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی، پان لگا کر کھایا۔ ماما کو پکارا، چہ بھر دایا، پھر پلنگ پر جالینی۔ چہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق اٹے پلے، مگر وہ سب کئی کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا۔ بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مج میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ ”اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا، جلا دیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات، جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں، انہیں کون مٹا سکتا ہے۔“

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزے لگے۔ قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے، مگر پھر میں نے اپنے تنکے سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر ایک باریوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور قصوں کو پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا، کیوں کہ ان کے پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں، درحقیقت کوئی اصل

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقعہ ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گہن یا پانہ گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے دورِ دفع دفع ہو گئیں، مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا، تعویذ، نوئے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی

میرے عاشق زاد میری دولت اور کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، صرف میری سندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین، مجھے چھینک آئی اور ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت، دن، گھاگ گھاگ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دوا ایک صاحب ہیں۔ بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو۔ نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے، نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو دل سے چاہتی ہوں اور یہ بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انہیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا۔ مگر یہ تمنا ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے، خصوصاً عورت کے لئے، مگر رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھتو کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں، اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں نکلیں گی، اور رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دیئے، سینکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہوجاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا روادار بھی نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے، اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث بن گئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا مزے دار جیوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں، وہی گناہی باروں کو کھانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر بیٹھیں۔ اس کی جو رو خوبصورت، کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں دیکھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا بگڑیں، مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطر میں بولنے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا پھسلا کے کھایا آخر کھلے ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا

سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی بننے کی نہ تھیں۔ اس لئے میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی گرفتار، کوئی خفائی، کوئی بیوقوف، کوئی دیوانی سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اپنی کی، کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دست بردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجھے پر ہمارا وقت رہ گئی۔ یا کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی، رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے ”آخر رنڈی تھی نا، کفن کا چوٹا کیا۔“ مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماش بین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے ”کفن کا چوٹا کیا“ یا ”مرتے مرتے کفن لے مری۔“ یعنی اپنے دام بچائے اور از راد فریب تماش بین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی اور لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ جج تائب ہو گئی اور اب انتہائی نیک ہوں، مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی کی محبت کروں اور اس محبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا ہی بے سود ہو گا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ معے یا س دولت ہے، اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے سن چکی ہوں جو بے درجہ مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں، حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں، جنہوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں کہنا تو کیسا پڑھا بھی نہ ہو گا۔ ایک صاحب میری علمیت کے قائل ہیں۔ خود بھی پڑھے لکھے ہیں، مگر مجھ کو ”مولانا بالفضل اولانا“ سمجھتے ہیں۔ معمولی مسیخے روزہ نماز کے بھی مجھ ہی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا متقلد ہیں۔ ایک

ایسے دیئے گئے ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ من جملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے، بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت، بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے، جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے، سب اسے پسند کرتے ہیں، مگر اصل قدر دان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو، ایک بد صورت مرد بھی، خوبصورت سے خوبصورت عورت کی رائے میں خوشبو دار پھول کی طرح دل پسند ہے، اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں، اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اس مرد میں ایک حد تک پایا جاتا ہے، جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے، یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی؟

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڑھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں، مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے، اس لئے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڑھے کے اس کی زیادہ توقع ہو سکتی ہے، اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دے دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت حاصل کرنا دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے، لہذا وہ اس کے چمپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو مرد اس موقع پر بیان کئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے، نہ عورتوں کو، تو میں اسے تسلیم کر لوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ انہیں اس کا شعور بھی ہو۔ میں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ امور دریافت کئے ہیں اور

تھا۔ نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف لڑکیوں نے کسی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ اس حماقت میں میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں۔ مگر جب وہ جوان ہوئی، لے دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ملاگیری کرنے کو رکھ دیا۔

آبادی نے بھی مجھے جل دیا ہوتا، مگر وہ تو کہو اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے، نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھ دار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ ہی عورت ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ جاتے ہم ہیں، پھر ان کو کیوں دیں۔

لگے قدر دان مرد زوال حسن کے بعد کنارہ کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ جھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرض کہ مردان سے کنارہ کش اور یہ مردوں کی شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہلے میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھ اس کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی، مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے، اور نواب صاحب جنہوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا، اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی میں مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملے میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں، ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجئے) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی پناک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد بچے دل سے انہماق عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں انہماق عشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے، اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں، کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت خمیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ دونوں، یا کم از کم ایک، کو سمجھ ہو۔ واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہائی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے، اس لئے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں اس لئے ان کو بعض وصف

میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا، وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے، اس لئے ان کو اپنے زمانہ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔ میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دقتیں دور ہو جائیں۔ مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے۔ ”اودہ جی! جو تقدیر میں ہو گا، ہو کے رہے گا۔“ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں نہ رد کو۔ ہمارے کئے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بد کاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہو گا تقدیر سے ہو گا۔ یعنی جو نتیجہ نکلے گا، وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہو گا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانہ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے چھانک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار نماز صبح کے بعد بادشاہ ٹہلتے ہوئے اُدھر آئے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا، آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یوں ہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا، پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا۔ فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی۔ میان سے بہ دقت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگائی۔ خود جو دلاستی باندھے ہوئے تھے، جس کا طلائی قبضہ تھا، معہ کمر بند مرصع اس کے حوالے کی۔ اس موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودہ) آگئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ:- دیکھنا بھی کیا سبباً جو ان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی۔ (کمر سے نکال کر یہ دیکھو۔

وزیر:- قبلہ عالم! سبحان اللہ! مگر حضور سا جو ہر شناس اور قدردان بھی تو ہوا، جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ:- مگر دیکھنا بھی، میری تلوار کچھ ایسی بد زیب نہیں ہے۔

وزیر:- نخل سبحانی کی تلوار اور بد زیب!

بادشاہ:- مگر لباس اس کے مناسب نہیں۔